

حقیقت کی گواہی

الحاد سے اسلامی حقائق تک

تالیف

مفتی نوید اختر سوہتن

شیلانگ، میگھالیہ

email : distinctmufti@gmail.com

حقیقت کی گواہی

الحادسے اسلامی حقائق تک

مفتی نوید اختر سوہتن

Haqeeqat ki Gawahi

ElhadseIslamiHaqaiqTak

Mufti Naved Akhtar Sohtun

Edition 2025

Pages : 216

Printed by : FIPS New Delhi.

Printed by :

Mufti Naved Akhtar Sohtun

Shillong, Meghalaya.(India)

email : distinctmufti@gmail.com

فہرست مضامین

صفحہ نمبر	عنوان
۹	مقدماتی حصہ
۹	تقریظ اول مفتی فاروق مدنی دامت برکاتہم
۱۲	تقریظ دوم مفتی محمد اویس رشادی دامت برکاتہم
۱۵	پیش لفظ
۲۳	چند اہم اصطلاحات
۳۳	باب اول: الحاد اور الہیات کا بنیادی تصور
//	الہیات: ایک مختصر تعارف
۳۶	الحاد کیا ہے؟
۴۰	الحاد کی مختصر تاریخ
۴۲	مغرب میں الحاد کا ارتقاء
۵۰	الحاد کی ابتدا: اس کے عوامل اور پس منظر
۵۲	الحاد کی طرف بڑھتے رجحان کے اسباب
۵۹	الحاد کے منفی اثرات
//	اخلاقی زوال
۶۱	صحیح اور غلط کا نسبتی تصور

صفحہ نمبر	عنوان
۶۳	بے مقصدیت اور اخلاقیات کا تعلق
//	اخلاقیات: معرفت اور وجود کے درمیان فرق
//	امید کا خاتمہ
۷۵	محبت اور قربانی کی بے معنویت
۷۶	حقیقی خوشی کا اسلامی تصور: الحاد کی دنیا میں ایک کھوئی ہوئی نعمت
۷۸	الحاد کیوں غلط ہے؟
۷۹	ارتقاء، عقل اور سچائی کا باہمی تعلق
۸۱	ایک عام اعتراض اور اس کا تجزیہ
۸۳	باب دوم: خدا کے وجود کے دلائل
۸۴	کائنات کی ابتدا اور بگ بینک کا نظریہ
۸۵	قانون حرکیات اور کائنات کی تخلیق
//	کلامی کائناتی دلیل
۹۰	بغیر خدا کے کائنات کا وجود کیوں ناممکن ہے؟
۹۲	پہلی علت کو ناجائنا خدا کے انکار کی دلیل نہیں
۹۳	کائنات کے نازک توازن کی دلیل
۹۶	زندگی کا وجود: غیر حیات سے حیات تک کا سفر
۹۷	ملر-یوری تجربہ اور اس کے محدود نتائج
۹۸	70 سال گزر جانے کے باوجود کوئی حقیقی پیش رفت نہیں
۹۹	ایو جینیٹکس اور ارتقاء کا مغالطہ

صفحہ نمبر	عنوان
۱۰۱	فطرتِ انسانی میں خدا کا تصور
۱۰۷	انبیاء کی صداقت: خدا کے وجود اور پیغام کی دلیل
۱۱۱	پاسکل کی منطقی تجویز کا تجزیہ
۱۱۲	باب سوم: خدا کے وجود اور مذہب پر ہونے والے اعتراضات
//	کے جوابات
۱۱۳	اعتراض نمبر 1: اگر عدم سے کچھ بھی وجود میں نہیں آسکتا تو خدا نے کائنات کو
//	عدم سے کیسے پیدا کیا؟
۱۱۷	اعتراض نمبر 2: کیا کائنات خود سے وجود میں آسکتی ہے؟
۱۱۹	اعتراض نمبر 3: کیا کائنات کو کسی اور کائنات نے تخلیق کیا؟
۱۲۰	اعتراض نمبر 4: "گاڈ آف دی گپس" (God of the Gaps) کا
//	اعتراض اور اس کا جواب
۱۲۴	اعتراض نمبر 5: اگر ہم مان لیں کہ خدا موجود ہے، تو یہ کیسے مانا جائے کہ
//	صرف ایک ہی خدا ہے؟ کیوں نہ دو، تین یا کئی خدا ہوں؟
۱۲۶	اعتراض نمبر 6: اگر خدا موجود ہے اور وہ مہربان اور رحم کرنے والا ہے، تو
//	دنیا میں اتنی برائیاں، مصیبتیں، اور دکھ کیوں ہیں؟
۱۳۱	اعتراض نمبر 7: اگر خدا اچھا ہے تو وہ برائی کیوں پیدا کرتا ہے؟ کیا برائی کا
//	خالق خود بھی برا نہیں؟
۱۳۵	اعتراض نمبر 8: اگر خدا موجود ہے تو وہ اپنی موجودگی کا واضح ثبوت کیوں
//	نہیں دیتا؟

صفحہ نمبر	عنوان
۱۳۸	اعتراض نمبر 9: مذہب نے تاریخ میں جنگوں اور خونریزی کو کیوں
//	اجازت دی؟
۱۴۵	اعتراض نمبر 10: سائنس نے خدا کے وجود کے دروازے بند کر
//	دیے ہیں۔
۱۵۰	اعتراض نمبر 11: مذاہب کو سوسائٹی میں نظم قائم کرنے کے لیے گھڑ لیا
//	گیا ہے۔
۱۵۲	اعتراض نمبر 12: اگر یہ دنیا آزمائش ہے تو یہ کہاں کا انصاف ہے کہ
//	مسلمانوں کے لیے آزمائش کم ہو کیونکہ وہ مسلم گھرانوں میں پیدا ہوئے
//	ہیں، جبکہ غیر مسلم بے چارے غیر مسلم گھرانوں میں پیدا ہوئے ہیں؟ اب
//	اگر وہ اس امتحان میں ناکام ہو جاتے ہیں تو ان کی غلطی کیوں؟
۱۵۵	اعتراض نمبر 13: جب خدا نے وقت اور مکان (Time and
//	Space) کو پیدا کیا ہے، تو وقت اور مکان سے پہلے خدا کہاں تھا؟
۱۵۷	اعتراض نمبر 14: اسلام دوسروں کو کافر جیسے توہین آمیز لفظ سے پکارتا ہے،
//	تو ایسے مذہب کو کیوں مانا جائے؟
۱۶۲	اعتراض نمبر 15: اللہ کو کسی کی عبادت کی ضرورت کیوں ہے؟
۱۶۵	اعتراض نمبر 16: اللہ کی عبادت صرف انسانوں سے کیوں؟
۱۶۸	اعتراض نمبر 17: اگر انسان کو نیک اور بد میں اختیار دینا تھا، تو اللہ نے
//	فرشتوں (ملکیت) اور حیوانات (بہیمیت) کی طرح کیوں نہیں پیدا کیا؟
//	کیوں ایک درمیانی مخلوق بنائی جو کشمکش میں مبتلا ہے؟ کیا یہ ظلم نہیں؟

صفحہ نمبر	عنوان
۱۷۲	اعتراض نمبر 18: اگر اللہ نے سب کو ایک جیسا پیدا کیا ہوتا، سب کو ایک جیسا ذہن دیا ہوتا، سب کو برابر کے مواقع دیے ہوتے، تو امتحان واقعی عادلانہ ہوتا۔ لیکن کوئی ذہین پیدا ہوتا ہے، کوئی نادان، کوئی امیر، کوئی غریب، تو پھر یہ انصاف کیسے ہے؟
۱۷۶	اعتراض نمبر 19: اگر اللہ کو پہلے سے معلوم ہے کہ کون جنت میں جائے گا اور کون جہنم میں، تو پھر امتحان کا کیا فائدہ؟ کیا یہ صرف ایک رسمی کارروائی نہیں؟
۱۸۰	اعتراض نمبر 20: خدا نے ہمیں زندگی دی، لیکن ہم سے یہ پوچھا ہی نہیں گیا کہ ہمیں پیدا ہونا ہے یا نہیں۔ کیا یہ بردستی نہیں؟ کیا کسی کو بغیر اجازت دنیا میں لانا ظلم نہیں؟
۱۸۴	اعتراض نمبر 21: اگر اللہ سب کچھ خود بخود چلا رہا ہے، تو دعا کی کیا ضرورت؟ کیا دعا اللہ کے فیصلے کو بدل سکتی ہے؟ اگر ہاں، تو کیا اس کا مطلب یہ نہیں کہ اللہ کا پہلے کا فیصلہ غلط تھا؟
۱۸۸	اعتراض نمبر 22: اگر کوئی شخص نیک زندگی گزارتا ہے لیکن اسلام قبول نہیں کرتا، تو کیا وہ بھی جہنم میں جائے گا؟ کیا یہ انصاف ہے؟
۱۹۲	اعتراض نمبر 23: اگر اللہ واقعی موجود ہے، تو پھر مذہب کو پھیلانے کے لیے نبیوں کی ضرورت کیوں؟ کیوں اللہ خود سب پر اپنی حقیقت واضح نہیں کرتا؟
۱۹۵	اعتراض نمبر 24: اگر اسلام سچ ہے تو کیا وجہ ہے کہ آج سب سے زیادہ

صفحہ نمبر	عنوان
//	پریشان حال مسلم ممالک ہی ہیں، چاہے وہ غرہ ہو یا برما؟ جبکہ اللہ کو نہ
//	ماننے والے ہی طاقتور اور سکون کی زندگی گزار رہے ہیں؟
۲۰۱	اعتراض نمبر 25: اگر کوئی چیز بھلا دی جائے تو کیا وہ درست ہے؟ اگر عہد
//	الست حقیقی تھا، تو پھر لوگوں کو دنیا میں آ کر وہ کیوں یاد نہیں رہتا؟
۲۰۲	اعتراض نمبر 26: اگر اسلام واقعی ایک عادلانہ اور پُر امن مذہب ہے،
//	تو پھر دانشور اور تعلیم یافتہ غیر مسلم اسے معاشرے کے لیے خطرہ کیوں
//	سمجھتے ہیں؟
۲۰۹	چند معروضات



تقریظ

حضرت مفتی محمد فاروق عباس الفلاحی المدنی دامت برکاتہم
خادم الحدیث والتفسیر، جامعہ اکل کوا و جامعہ فلاح دارین

نحمدہ و نصلی علی رسولہ الکریم، أما بعد

اللہ رب العزت ارشاد فرماتے ہیں:

فُطِرَ اللَّهُ الَّتِي فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا لَا تَبْدِيلَ لِخَلْقِ اللَّهِ

(الرّوم: ۳۰)

یہ اللہ کی فطرت ہے، جس پر اس نے لوگوں کو پیدا کیا، اللہ کی تخلیق میں کوئی تبدیلی نہیں۔

نیز ارشاد باری ہے:

سَنُرِيهِمْ آيَاتِنَا فِي الْآفَاقِ وَفِي أَنْفُسِهِمْ حَتَّى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ
أَنَّهُ الْحَقُّ - (فصلت: ۵۳)

ہم انہیں اپنی نشانیاں آفاق میں اور خود ان کے نفس میں دکھائیں گے، یہاں تک کہ ان پر واضح ہو جائے کہ بے شک یہی حق ہے۔

مزید حق تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

وَفِي أَنْفُسِكُمْ أَفَلَا تُبْصِرُونَ - (الذاریات: ۲۱)

اور خود تمہارے نفس میں بھی (نشانیاں ہیں)، کیا تم نہیں دیکھتے؟

یہ مشتمل از خروارے کے طور پر دو تین آیات کریمہ ہیں۔ اس کے علاوہ آیاتِ قرآنیہ، آیاتِ تکوینیہ، آیاتِ آفاق، شواہد اور جتنے بھی مبرہنات ہیں، وہ سب بغیر کسی زیادہ امعانِ نظر کے دلالت کرتے ہیں کہ اس عالم کا صانع، صانعِ مقنن حق تعالیٰ شانہ ہے اور یہ دنیا اسی کے بنائے ہوئے مقرر کردہ نظام کے تحت چلتی ہے۔ اسباب میں تاثیر و ہی پیدا کرتا ہے۔ یکبارگی دنیا کا وجود عقلِ سلیم کے سراسر منافی ہے۔ عقلِ سلیم اور نقلِ صحیح میں نہ کبھی تعارض و تناقض ہوا ہے اور نہ ہو سکتا ہے، مگر فطرت کے خلاف بلا کسی مضبوط دلیل کے اپنے آپ کو زیرو سے ہیرو بنانے کی محنت کرنے والے اور خدائے پاک کے عطیہ عقل و شعور کو قطعاً استعمال نہ کرنے والے لوگ ہی منکرینِ خداوند اہو سکتے ہیں۔

اس دور میں الحاد کا اصل پس منظر، بلکہ اس کا محرک اور داعی آزاد پسندی ہے اور نفسانی خواہشات کے تابع رہ کر اپنی فانی دنیا کو باقی سمجھ کر گزارنا ہے، مگر اس متصور غیر متحقق آزادی میں قلبی مسرت و فرحت، فطری سکون، ملحدین میں سے کسی کو بھی نہ میسر ہوا ہے اور نہ میسر ہوگا۔

قرآن کریم کہتا ہے:

أَوَلَمْ يَتَفَكَّرُوا مَا بِصَاحِبِهِمْ مِّنْ جَنَّةٍ إِن هُوَ إِلَّا نَذِيرٌ

مُبِينٌ۔ (الأعراف: ۱۸۴)

کیا انہوں نے غور نہیں کیا کہ ان کے ساتھی میں (یعنی نبی کریم ﷺ میں) کوئی جنون نہیں، وہ تو صرف ایک کھلا ہوا ڈرانے والے ہیں۔

ن وَالْقَلَمِ وَمَا يَسْطُرُونَ مَا أَنتَ بِنِعْمَةِ رَبِّكَ بِمَجْنُونٍ۔

(القلم: ۱-۲)

نون، قسم ہے قلم کی اور اس چیز کی جو وہ لکھتے ہیں، آپ اپنے رب کے فضل سے مجنون نہیں ہیں۔

اتباعِ شرع خداوندی میں ہی طبیعت کا سکون، قلب کا اطمینان اور ذہن کا ارتقاء بھی ہے۔ ماضی اور حال کی تاریخ اور شواہد اس پر عیاں ہیں کہ ملحدین تقریباً تقریباً جنون عقلی، سراسیمگی افکار اور تشطیطِ نظر کا شکار ہیں، اس لیے کہ حیاتِ طیبہ اقرار و اعتراف و حدتِ رب ہی میں ہے۔

مبارک باد پیش کرتا ہوں ہمارے عزیز، قابلِ صداقت و اعتراف و افتخار و نوبتِ اختر زید مجاہد کو کہ انہوں نے وقت کے اہم ترین موضوع پر قلم اٹھایا اور اس کے پیچھے اپنے شب و روز کی محنت کو صرف کیا اور حق تعالیٰ شانہ کے اعتراف و اقرار کی طرف، بلکہ یہ کہیے کہ صحیح فطرت کی طرف انسانیت کو لانے کے لیے اور حیوانیت و بہیمیت کی فہرست سے نکالنے کے لیے یہ مضبوط اور گہر بار قلم چلایا۔

اللہ رب العزت ان کی اس محنت کو شرفِ قبولیت بخشے اور ان کی اس سعی مشکور کو ان کے والدین، اساتذہ کرام اور فکری مہمیز دینے والوں کے حق میں صدقہ جاریہ بنائے۔

هَذَا مَا عِنْدِي وَلَا أَرْجِي عَلَى اللَّهِ أَحَدًا، وَصَلَّى اللَّهُ وَسَلَّمَ
عَلَى نَبِيِّنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدٍ وَعَلَى آلِهِ وَأَصْحَابِهِ أَجْمَعِينَ

محمد فاروق عباس الفلاحی المدنی

غادم الحدیث والتفسیر

جامعہ اکل کو او جامعہ فلاح دارین



تقریظ

حضرت مفتی محمد اویس رشادی دامت برکاتہم

استاذ دارالعلوم شاہ ولی اللہ بنگلور

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد لله الذی هدانا لهذا سواء الطريق، وجعل لنا التوفیق

خیر رفیق، والصلوة والسلام علی سید الأنبیاء

والمرسلین، محمد وعلی آلہ واصحابہ اجمعین، اما بعد!

کسی چیز کا سمجھ میں نہ آنا اس کے باطل ہونے کی دلیل نہیں یہ اصول مسلم ہے۔ موجودات، موجد کے وجود پر شاہد ہیں، مصنوعات، صانع کے وجود پر دلیل ہیں، مخلوقات، خالق کے ہونے پر ثبوت ہیں۔ یہ دلائل مبرہن ہیں۔ اللہ کے وجود کا یقین رکھنا ایمان کے بنیاد کا پتھر ہے، اس یقینی بات کا انکار کفر کا دلدل ہے۔

اس دنیا میں جتنے بھی ازم ہیں، وہ کسی نہ کسی حد تک اس بنیادی عقیدہ کو کھوکھا کرنے میں بنیادی رول ادا کرتے رہے ہیں، جس کے نتیجے میں ایک بڑی تعداد اس کفر کے گڑھے میں جا گری۔ جو لوگ پہلے سے ذہنی آزادی کے شکار تھے اور نفسانی عیاشی کے دلدادہ تھے، احکام کی پابندیوں میں آنا نہیں چاہتے تھے، انہوں نے اس نظریہ کو ہاتھوں ہاتھ لے لیا اور انکارِ خدا کے مرتکب ہو گئے، تاکہ نہ خدا رہے، نہ خدا کا کوئی قانون رہے۔

العیاذ باللہ، الامان الحفیظ۔

وَسَيَعْلَمُ الَّذِينَ ظَلَمُوا أَيَّ مُنْقَلَبٍ يَنْقَلِبُونَ۔

اللہ کے دشمن ہر زمانے میں رہے، جنہوں نے اس کی شان اقدس میں گستاخیاں کیں، لیکن ان سب گستاخیوں میں بھاری گستاخی ان لوگوں کی طرف سے ہوئی جو خدا ہی کا انکار کر دیتے ہیں۔ یقیناً وہ بڑا بد بخت ہے، جو بے حیثیت ہونے کے باوجود اپنے ہی خالق کی شان میں نازیبا کلمات ادا کرتا ہے۔ بد طینت ہے وہ ابولہب، جو اپنے محسن حقیقی کے احسانات کو فراموش کرتا ہے۔

اس دجالی دور میں، جہاں اور فتنے پنپ رہے ہیں، وہیں یکس مسلم اور ملحدین و منکرین خدا سرچڑھ کر بول رہے ہیں اور سادہ لوح عوام کو سوشل میڈیا کے پلیٹ فارم سے ورغلائے اور ذہن میں شک و شبہ کے بیج ڈالنے کی ناپاک کوشش میں لگے ہوئے ہیں۔ ایسے وقت میں علماء کی ذمہ داری بنتی ہے کہ قلم و قسط کے ذریعہ اور پسند و نصح کے ذریعہ امت کے عقیدہ کی حفاظت کی تدبیر سوچیں۔

ماشاء اللہ! اس میدان میں بہت سے جید علماء اور اہل علم، ان فاسد نظریات کے حاملین کی بیخ کنی میں مصروف عمل ہیں۔ اس فہرست میں ایک اضافہ زیر نظر کتاب ”حقیقت کی گواہی“ ہے، جس کے مصنف مولانا مفتی نوید اختر صاحب شاہی قاسمی صاحب زید علمہ ہیں۔ موصوف نوجوان عالم و فاضل ہیں، امت مسلمہ کے تئیں خیر خواہی کا جذبہ رکھتے ہیں۔ راقم السطور نے اس کتاب کے چیدہ چیدہ مقامات سے مطالعہ کیا، بہت مفید پایا۔ لگتا ہے کہ موصوف نے مواد کو جمع کرنے میں عرق ریزی سے کام لیا ہے، کئی کتابوں کا مطالعہ کیا ہے، اور اس باطل نظریہ کی تردید میں ان انگریزی اصطلاحات کو پیش کیا ہے، جس کو اس دور میں استعمال کیا جاتا ہے۔ مطالعہ کے دوران خواہش تھی کہ بالاستیعاب استفادہ کروں، لیکن رمضان المبارک کی مصروفیات مانع رہیں۔

بندہ خصوصاً نوجوانوں اور فارغ علماء سے گزارش کرتا ہے کہ اس کتاب کا مطالعہ ضرور کریں اور اس کی روشنی میں امت کے عقیدہ کے تحفظ کا فریضہ ادا کریں۔
 اخیر میں، یہ عاجز دعا گو ہے کہ اللہ تعالیٰ اس گراں قدر خدمت کو شرف قبولیت سے نوازے، اور افادیت کو عام و تمام فرمائے، اور مصنف کے حق میں صدقہ جاریہ بنائے۔ آمین۔

والسلام علی النبی الکریم
 بندہ: محمد اویس رشادی عفی عنہ
 استاد: دارالعلوم شاہ ولی اللہ، بنگلور
 ۱۰ رمضان المبارک ۱۴۴۶ھ، بوقت بعد نماز عصر



پیش لفظ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

یہ سوال اکثر میرے سامنے آتا رہا کہ ایسی کون سی کتاب ہے جو اسلام پر کیے گئے اعتراضات کا جامع اور مدلل جواب فراہم کرے؟ وہ کتاب جو ایک طرف قرآن و حدیث پر کیے گئے سوالات کا دفاع کرے، تو دوسری طرف تاریخ، فقہ اور استدلال کے میدان میں اٹھائے جانے والے ہر اعتراض کا واضح اور محکم جواب بھی دے۔ افسوس کہ اردو زبان میں ایسی کوئی کتاب میرے علم میں نہ تھی جو ہر پہلو کو محیط ہو۔ یہی وہ احساسِ خلا تھا جس نے مجھے مجبور کیا کہ میں خود اس بوجھ کو اٹھاؤں، یہ ذمہ داری قبول کروں اور اسلام کے خلاف پھیلائے گئے شکوک و شبہات کے دھوئیں کو علم و تحقیق کی روشنی سے صاف کروں۔

آج کا دور انتشار اور فکری انحراف کا دور ہے۔ خاص طور پر ہندوستان میں بڑھتی ہوئی فرقہ واریت، جھوٹے تاریخی بیانیے، اور مذہب کے خلاف نفرت انگیز مہم نے ایک علمی جواب کی شدت سے ضرورت پیدا کر دی ہے۔ آج کے دور میں، جب سوشل میڈیا اور میڈیا کے دیگر ذرائع کو اسلام کے خلاف ایک ہتھیار کے طور پر استعمال کیا جا رہا ہے، ضروری تھا کہ اسلام پر ہونے والے ہر اعتراض کو جمع کر کے اس کا علمی اور عقلی رد پیش کیا جائے۔ اسی جذبے کے ساتھ، میں نے اس کتاب ”حقیقت کی گواہی“ کو ترتیب دینے کا فیصلہ کیا، تاکہ یہ ہر اس شخص کے لیے ایک مضبوط علمی ہتھیار بنے جو سچائی کی تلاش میں ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ باری تعالیٰ کا وجود کسی پیچیدہ فلسفیانہ استدلال یا گہری منطق کا محتاج نہیں۔ جو شخص اخلاص کے ساتھ حق کی تلاش میں ہو، اس کے لیے ایک معمولی دلیل بھی کافی ہوتی ہے۔ یہ فطرت کا ایک سادہ سا اصول ہے کہ ہر اثر کسی مؤثر کی نشاندہی کرتا ہے، ہر نشان کسی راہرو کے گزرنے کی گواہی دیتا ہے۔ یہی وہ سچائی ہے جسے ایک سادہ بدوی نے نہایت جامع اور پُر اثر انداز میں بیان کیا:

سُئِلَ أَعْرَابِيٌّ عَنِ الدَّلِيلِ فَقَالَ: البعرة تدل على البعير،
والروث على الحمير، وآثار الأقدام على المسير، فسباء
ذات أبراج، وأرض ذات فجاج، وبحار ذات أمواج أما
تدل على الصانع الحكيم؟ (۱)

ایک بدوی سے دلیل کے بارے میں سوال کیا گیا تو اس نے جواب دیا:
”اونٹ کی مینگنی اونٹ کے ہونے پر دلالت کرتی ہے، گدھوں کا گوہر گدھوں کے
ہونے پر دلالت کرتا ہے، اور قدموں کے نشانات مسافر کے گزرنے پر دلالت کرتے
ہیں۔ تو کیا ستاروں سے بھرا آسمان، راستوں والی زمین، اور موجوں والے سمندر ایک
حکیم و دانایا خالق کے وجود پر دلالت نہیں کرتے؟“

اس کتاب کا مقصد مشکل فلسفیانہ گتھیوں میں الجھنا نہیں، بلکہ فطری اصولوں اور واضح
حقائق کی روشنی میں قارئین کی فکری اور عقلی رہنمائی کرنا ہے۔ جو کوئی غیر جانبداری کے
ساتھ غور و فکر کرے، وہ حق کو ضرور پالے گا۔ لیکن مسئلہ یہ ہے کہ آج کے دور میں حق کو
پہچاننا آسان نہیں رہا، کیونکہ سچائی پر شکوک و شبہات کے پردے ڈال دیے گئے ہیں،
اور ہر طرف فکری الجھنیں بکھری ہوئی ہیں۔ سوشل میڈیا، مستشرقین کی تحریریں، جھوٹے

تاریخی بیانیہ، اور میڈیا پروپیگنڈے نے حقیقت کو دبانی کی کوشش کی ہے۔ عام انسان کے لیے سچ اور جھوٹ میں فرق کرنا مشکل بنا دیا گیا ہے۔

یہی وہ احساس تھا جس نے مجھے اس کتاب کی تیاری پر آمادہ کیا، اور یہی وہ محرک تھا جسے شیخ محمد عوامہ نے اپنی کتاب ”نشر المیراث النبوی“ میں مزید تفصیل کے ساتھ پیش کیا۔ یہ تجویز نہایت اہم اور قابل غور ہے، اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ شیخ محمد عوامہ کی اس رائے کو یہاں نقل کیا جائے، تاکہ قارئین تک اس کی افادیت پہنچے اور وہ اس سے مستفید ہو سکیں۔

شیخ محمد عوامہ کی تحقیقاتی مرکز کے قیام کی تجویز - خلاصہ

شیخ محمد عوامہ نے سنت نبوی اور حدیث پر کیے جانے والے اعتراضات کا مستند، تحقیقی اور علمی بنیادوں پر جواب دینے کے لیے ایک آزاد تحقیقی مرکز کے قیام کی تجویز دی، تاکہ ان شبہات کا منظم، مدلل اور متوازن رد کیا جاسکے۔

یہ مرکز چار بنیادی کام انجام دے گا:

شبہات کا جمع کرنا: سنت نبوی اور حدیث پر کیے گئے اعتراضات کو قدیم و جدید کتب، مقالات، ویب سائٹس اور میڈیا ذرائع سے اکٹھا کر کے ایک جامع علمی ذخیرہ تیار کیا جائے۔

ہر اعتراض کو گہرائی سے سمجھا جائے، اس کے پس منظر کو پرکھا جائے اور اس کا علمی و تحقیقی جواب تیار کیا جائے۔

شدت پسندی یا جذباتیت کے بجائے استدلالی اور متوازن انداز اختیار کیا جائے۔

اعتراضات کو موضوعاتی اور نظریاتی بنیادوں پر ترتیب دیا جائے تاکہ قارئین اور محققین کے لیے ان کا مطالعہ اور ان کے جوابات تک رسائی آسان ہو۔
محققین کی تربیت: ایسے ریسرچ اسکالرز اور علماء کی تیاری جو تحقیقی صلاحیتوں سے آراستہ ہوں، علمی صبر و استقامت رکھتے ہوں، اور ہر بات کو اس کے اصل ماخذ سے پرکھنے کا مزاج رکھتے ہوں۔

یہ مرکز نہ صرف سنت پر کیے گئے اعتراضات کا علمی دفاع کرے گا بلکہ سنت نبوی کے علمی ورثے کو محفوظ رکھنے میں بھی کلیدی کردار ادا کرے گا۔ اس کا مقصد امت مسلمہ کے لیے ایک مستند علمی و تحقیقی مرکز بنانا ہے، جہاں سے حدیث و سنت کے متعلق ہر قسم کی تحقیق اور مستند مواد حاصل کیا جاسکے۔

یہ شیخ محمد عوامہ کی تجویز کا خلاصہ ہے، اور جب میں نے اسے پڑھا، تو محسوس کیا کہ یہ ایک نہایت اہم علمی ضرورت ہے، اور اگر اس پر منظم انداز میں کام نہیں ہو رہا، تو میں اپنی استطاعت کے مطابق اس کی شروعات کروں گا۔

شیخ کی اس تجویز نے میرے لیے ایک نیا فکری دروازہ کھولا۔ اگر سنت نبوی پر کیے گئے اعتراضات کو جمع کر کے ان کا علمی و تحقیقی جواب دینا ضروری ہے، تو اسی اصول کے تحت پورے مذہب اسلام پر کیے جانے والے اعتراضات کا بھی ایک جامع اور مدلل تجزیہ کیوں نہ کیا جائے؟ کیونکہ اعتراضات محض حدیث تک محدود نہیں، بلکہ قرآن، تاریخ، فقہ، اور مذہب کے بنیادی عقائد تک کو نشانہ بنایا جا رہا ہے۔ اسی بنیاد پر میں نے فیصلہ کیا کہ یہ کتاب محض حدیث کے دفاع تک محدود نہیں رہے گی، بلکہ پورے مذہب اسلام پر کیے جانے والے اعتراضات کا بھی ایک جامع تجزیہ پیش کرے گی۔ چنانچہ اس پہلی جلد میں مذہب پر عمومی اعتراضات اور خدا کے وجود سے متعلق شبہات

کا جائزہ لیا گیا ہے۔ یہ ایک سنگِ میل ہے، لیکن سفر ابھی باقی ہے!

کامل ہے فقط کلام الہی
میری تحریر ہرگز بے عیب نہیں

یہاں میں اعتراف کرنا چاہتا ہوں کہ یہ کتاب ہرگز کامل اور بے عیب نہیں۔ میں نے اپنی استطاعت کے مطابق درست، مدلل اور تحقیقی مواد فراہم کرنے کی کوشش کی ہے، لیکن میں کسی صورت یہ دعویٰ نہیں کرتا کہ جو کچھ یہاں لکھا گیا ہے وہ غلطیوں سے پاک ہے۔

یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ کوئی بھی انسانی تحریر مکمل اور بے نقص نہیں ہو سکتی۔ یہی وجہ ہے کہ محدثین اور محققین ہمیشہ اپنی تحریروں میں تنقید اور اصلاح کی گنجائش رکھتے تھے۔ امام خطیب بغدادی رحمہ اللہ نے فرمایا:

لو عورض کتاب سبعین مرة لوجد فيه الخطأ، أبي الله أن
يكون كتاباً صحيحاً غير كتابه۔ (۱)

اگر کسی کتاب کو ستر مرتبہ بھی دیکھا جائے تب بھی اس میں غلطی پائی جائے گی۔ اللہ نے اپنی کتاب کے سوا کسی کتاب کو مکمل اور بے عیب ہونے کی اجازت ہی نہیں دی۔

اسی طرح قاضی عبدالرحیم السیدانی رحمہ اللہ نے فرمایا، جسے امام زبیدی رحمہ اللہ نے نقل کیا ہے:

لا يكتب إنسان كتاباً في يوم إلا قال في غده: لو غير هذا
لكان أحسن، ولو زيد كذا لكان يستحسن، ولو قدم هذا
لكان أفضل، ولو ترك هذا لكان أجمل، وهذا من أعظم
العبر، وهو

دلیل علی استیلاء النقص علی جملة البشر - (۱)

کوئی انسان ایسا نہیں جو ایک دن میں کوئی کتاب لکھے اور اگلے دن یہ نہ کہے کہ اگر اس میں یہ ترمیم کر دی جاتی تو بہتر ہوتا، اگر یہ اضافہ کیا جاتا تو اچھا ہوتا، اگر یہ ترتیب بدل دی جاتی تو زیادہ مناسب ہوتا، اگر یہ حصہ حذف کر دیا جاتا تو زیادہ عمدہ ہوتا۔ یہی سب سے بڑی نشانی ہے کہ انسانی تحریر ہمیشہ ناقص اور غیر مکمل ہوتی ہے لہذا ہر تحریر میں بہتری کی گنجائش ہوتی ہے، اور کوئی بھی انسان اپنی تحریر میں غلطیوں سے مبرا نہیں۔ اسی لیے میں تمام قارئین، اہل علم اور محققین سے درخواست کرتا ہوں کہ اگر وہ اس کتاب میں کوئی غلطی، کمی یا سقم پائیں تو مجھے ضرور مطلع کریں۔ میں اپنی غلطیوں کی درستی کو اپنی خوش نصیبی سمجھوں گا۔ آپ اپنی قیمتی آراء اور اصلاحات مجھے distinctmufti@gmail.com پر بھیج سکتے ہیں۔

اختتامیہ:

یہ تو محض آغاز ہے

بے شک، ہر بڑا کام وقت اور محنت کا تقاضا کرتا ہے، اور آج کے پرفتن دور میں اس کی ضرورت پہلے سے کہیں زیادہ بڑھ چکی ہے۔ ہماری تاریخ اس بات کی گواہ ہے کہ جب بھی کسی دور میں کوئی فتنہ سرا اٹھاتا، ہمارے اکابرین نے اس کا علمی اور فکری محاسبہ کیا اور باطل کو دلیل و برہان سے پسپا کیا۔ آج، جب فتنوں کی یلغار بے پناہ ہے، اور دین پر بے شمار اعتراضات کیے جا رہے ہیں، تو یہ اور بھی ضروری ہو جاتا ہے کہ ان تمام شکوک و شبہات کو یکجا کر کے ان کے علمی جوابات دیے جائیں۔

یہ حقیقت اپنی جگہ مسلم ہے کہ دین کی ہر خدمت اپنی نوعیت کے اعتبار سے انتہائی اہم ہے۔ کسی بھی میدان کی افادیت کو کم نہیں سمجھا جاسکتا، کیونکہ ہر شعبہ اپنے وقت اور مقام پر ضرورت رکھتا ہے۔ دعوت و تبلیغ، تدریس و تعلیم، تصنیف و تالیف، اصلاح معاشرہ اور دفاع اسلام یہ سب وہ پہلو ہیں جو مل کر دین کی حفاظت کا عظیم فریضہ انجام دیتے ہیں۔ ہر شخص اپنی استعداد اور مہارت کے مطابق کسی نہ کسی خدمت سے جڑا ہوتا ہے، اور یہی دین کی جامعیت کا حسن ہے۔ مگر موجودہ دور میں، جہاں فکری یلغار نے ایمان کی جڑوں کو کمزور کرنے کی کوشش کی ہے، وہاں ان اعتراضات کا مدلل جواب دینا بھی ایک ضروری خدمت بن چکی ہے۔ اگرچہ یہ کام وقت طلب اور صبر آزما ہے، مگر حق کا دفاع ہمیشہ سے اہل حق کا شیوہ رہا ہے، اور اس راہ میں کی جانے والی کوشش یقیناً باعثِ سعادت ہے۔

یہ کام ایک دن یا ایک کتاب میں مکمل ہونے والا نہیں، بلکہ یہ ایک طویل علمی و تحقیقی سفر کی شروعات ہے۔ میں نے اپنی استطاعت کے مطابق اس راہ میں پہلا قدم رکھا ہے، مگر یہ سلسلہ یہاں رکنے والا نہیں۔ ان شاء اللہ، آئندہ جلدوں میں قرآن، حدیث، تاریخ، فقہ، اور دیگر اہم موضوعات پر کیے جانے والے اعتراضات کا تفصیلی جواب دیا جائے گا۔ یہ کام محض اعتراضات کے جوابات دینے تک محدود نہیں، بلکہ ایک فکری اور تحقیقی جدوجہد کا آغاز ہے۔ یہ ایک ایسی کاوش ہے جو سچائی کو واضح کرنے، شکوک و شبہات کے پردے ہٹانے، اور دلیل و استدلال کی روشنی میں حق کو نمایاں کرنے کی ایک سنجیدہ کوشش ہے۔ یہ صرف ردِ اعتراض نہیں، بلکہ حقیقت کی گواہی ہے!

میری دعا ہے کہ یہ کوشش محض ایک فرد کی حد تک محدود نہ رہے، بلکہ اہل علم اور

محققین اس کارِ خیر کو مزید آگے بڑھائیں، اسے مضبوط کریں، اور امت کو فکری و علمی طور پر مضبوط بنیاد فراہم کرنے میں اپنا کردار ادا کریں۔
اللہ تعالیٰ ہمیں اخلاص عطا فرمائے، اور اس کام کو امت مسلمہ کے لیے نفع بخش بنائے۔

والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

نوید اختر سوہتین

شیلا ننگ، میگھالیہ

distinctmufti@gmail.com:Email

چند اہم اصطلاحات

یہاں ان اصطلاحات کی فہرست پیش کی جا رہی ہے جو الحاد اور دیگر فکری فتنوں کو سمجھنے اور ان کا تجزیہ کرنے کے لیے بنیاد فراہم کرتی ہیں۔ ان اصطلاحات کا صحیح ادراک ان نظریات کی حقیقت کو واضح کرنے اور ان کے اثرات کا تجزیہ کرنے میں مددگار ہوگا۔ یہ اصطلاحات کتاب کے مختلف مقامات پر آئیں گی، اس لیے ان کا مفہوم سمجھنا ضروری ہے تاکہ قارئین ان مباحث کو گہرائی سے جان سکیں اور اسلامی نقطہ نظر کو مضبوطی سے پیش کر سکیں۔

الحاد (Atheism):

آکسفورڈ ڈکشنری کے مطابق:

الحاد (Atheism) خدایا دیوتاؤں کے وجود کا انکار کرنے یا ان پر یقین سے انکار کا نام ہے۔

مثال: ”اس کی کتاب اس کے الحاد سے ایمان کی طرف سفر کی کہانی بیان کرتی ہے۔“
یہ اصطلاح 16 ویں صدی کے آخر میں فرانسیسی لفظ **athéisme** کے ذریعے یونانی لفظ **atheos** سے ماخوذ ہے، جہاں **a-** کا مطلب ہے ”بغیر“ اور **theos** کا مطلب ہے ”خدا“۔

مفہوم: یہ نظریہ خالق کائنات کے وجود کو رد کرتا ہے اور کائنات کے وجود کو محض اتفاق یا مادے کی علت قرار دیتا ہے۔ الحاد کو بعض اوقات دہریت (**Materialism**) کے ساتھ خلط ملط کیا جاتا ہے، حالانکہ یہ دونوں الگ نظریات ہیں اگرچہ دونوں کی بنیاد ایک ہے۔

لاادریت (Agnosticism)

آکسفورڈ ڈکشنری کے مطابق:

لاادریت (Agnosticism) اس عقیدے کو کہتے ہیں کہ خدا کے وجود یا اس کی حقیقت کے بارے میں کچھ بھی معلوم نہیں ہے یا معلوم نہیں ہو سکتا۔

انسانیت پسندی (Humanism):

انسانیت پسندی وہ نظریہ ہے جو انسانی عقل اور صلاحیتوں کو مافوق الفطرت معاملات پر ترجیح دیتا ہے اور اخلاقی زندگی گزارنے کی ذمہ داری انسان کی اپنی صلاحیتوں پر عائد کرتا ہے۔ یہ تحریک نشاۃ ثانیہ کے دور میں سامنے آئی، جس نے قرون وسطیٰ کے مذہبی نظام کو چھوڑ کر قدیم یونانی اور رومی افکار کو اپنایا۔ جدید دور میں اسے بعض ناقدین انسانی خود مختاری اور عقلیت پر مبنی نظام سمجھتے ہیں جو فرد کی حقیقی حالت کو نظر انداز کرتا ہے۔

اس فلسفے کا خلاصہ یہ ہے کہ انسان اپنی زندگی کا خود مختار اور فیصلوں کا واحد معیار ہے۔ اس نظریے کے تحت ہر مسئلے کا حل انسانی عقل اور فیصلے پر منحصر ہوتا ہے، نہ کہ وحی، انبیاء، یا خدائی تعلیمات پر۔ پروٹاگورس کا قول ”انسان ہر چیز کا پیمانہ ہے“ اس فلسفے کی بنیاد کو واضح کرتا ہے۔

سیکولر ازم (Secularism):

سیکولر ازم وہ نظریہ ہے جو ریاست اور مذہب کے درمیان مکمل علیحدگی کو فروغ دیتا ہے، تاکہ حکومت انسانی عقل اور تجربے پر مبنی قوانین کے تحت چلائی جائے۔ اس

کے مطابق حکومت اور قانون سازی مذہب کی بجائے انسانی عقل اور تجربے پر مبنی ہونی چاہیے۔ سیکولر ازم کا مقصد مذہبی امتیاز کو ختم کرنا اور تمام افراد کو ان کے عقائد سے بالاتر ہو کر مساوی حقوق فراہم کرنا ہے۔ اس کا اطلاق ایسے نظام میں ہوتا ہے جہاں مذہب کا ریاستی معاملات، سیاست، اور قانون سازی پر کوئی اثر نہ ہو۔ یہ نظریہ خدا اور مذہب کو انسان کی اجتماعی زندگی سے خارج کر دینے پر زور دیتا ہے۔

برل ازم (Liberalism):

برل ازم وہ فلسفہ ہے جو انفرادی آزادی، مساوات، اور جمہوری اقدار کو بنیادی اصول مانتا ہے۔ یہ ہر شخص کو اپنی رائے، زندگی کے فیصلے، اور آزادی اظہار کا حق دیتا ہے اور مذہب و ریاست کی علیحدگی پر زور دیتا ہے۔ برل ازم میں قانون سازی کی بنیاد انسانی خواہشات اور عقل پر رکھی جاتی ہے، جبکہ اسلام شریعت اور وحی کو حتمی رہنمائی کا ذریعہ تسلیم کرتا ہے۔ برل ازم کے تحت انسان خود مختار ہے، مگر اسلام فرد کی آزادی کو اخلاقی و دینی حدود کے اندر رکھتا ہے تاکہ سماجی عدل اور اللہ کی رضا حاصل ہو۔

نیہل ازم (Nihilism):

نیہل ازم ایک نظریہ ہے جو تمام مذہبی اور اخلاقی اصولوں کو رد کرتا ہے اور زندگی کو بے معنی سمجھتا ہے۔ فلسفے میں یہ عقیدہ بھی شامل ہے کہ دنیا میں کسی چیز کا حقیقی وجود نہیں۔ اسلام کے برعکس، جو زندگی کو مقصد اور اخلاقی اصولوں کے ساتھ جوڑتا ہے، نیہل ازم زندگی کو بے معنی قرار دے کر انسان کو ایک بے سمت حالت میں چھوڑ دیتا ہے۔
خلاصہ: نیہل ازم وہ نظریہ ہے جو زندگی کی معنویت اور اخلاقی اصولوں کو مکمل طور پر رد کر دیتا ہے، جو اسلامی عقائد سے صریح متصادم ہے۔

مابعد الطبیعیات (Metaphysics):

مابعد الطبیعیات فلسفے کی وہ شاخ ہے جو ان غیر مادی حقیقتوں پر غور کرتی ہے جو انسانی حواس سے ماورا ہیں، جیسے کائنات کی ابتدا، وجود، اور روحانی مظاہر، اللہ کی ذات (God's Existence) روح (Soul)، جنت و جہنم (Paradise and Hell)، فرشتے (Angels)، میدانِ محشر (Day of Judgment)۔ یہ تمام چیزیں ہمارے مادی تجربے سے ماورا ہیں اور ان کو سمجھنے کے لیے ایمان اور وحی کی رہنمائی ضروری ہے۔

خلاصہ: مابعد الطبیعیات وہ علم ہے جو مادی دنیا سے آگے کے حقائق کو سمجھنے کی کوشش کرتا ہے۔

قائم بالذات (Self-Existing):

قائم بالذات وہ وجود ہے جو اپنی بقا کے لیے کسی اور پر منحصر نہ ہو۔ اللہ تعالیٰ کی ذات قائم بالذات ہے، یعنی وہ کسی مخلوق یا سبب کا محتاج نہیں:

”اللَّهُ الصَّمَدُ“ (سورۃ الاخلاص: ۲)۔

قائم بالغیر (Dependent on Others):

قائم بالغیر وہ وجود ہے جو اپنی بقا اور وجود کے لیے کسی اور پر انحصار کرتا ہو۔ تمام مخلوقات، جیسے انسان، زمین، اور آسمان، قائم بالغیر ہیں، کیونکہ ان کا وجود اللہ کی تخلیق پر منحصر ہے۔

قدیم (Eternal):

قدیم وہ ہے جس کا کوئی آغاز نہ ہو۔ اللہ قدیم ہے، یعنی وہ ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا: ”وہی اول ہے اور وہی آخر۔“ (سورۃ الحديد: 3)۔

حادث (Created):

حادث وہ ہے جس کا آغاز ہو اور جو کسی وقت موجود نہ تھا۔ تمام مخلوقات حادث ہیں، کیونکہ ان کو ایک وقت میں پیدا کیا گیا۔

ممکن الوجود (Contingent Being):

ممکن الوجود وہ وجود ہے جو ہو بھی سکتا ہے اور نہ بھی ہو سکتا ہے۔ مخلوقات ممکن الوجود ہیں، کیونکہ ان کا وجود کسی سبب یا خالق (اللہ) پر منحصر ہے۔

خلاصہ: اللہ کی ذات قائم بالذات اور قدیم ہے، جبکہ مخلوقات قائم بالغیر، حادث، اور ممکن الوجود ہیں۔ یہ تفریق اسلامی عقائد میں اللہ کی عظمت اور مخلوق کی محدودیت کو واضح کرتی ہے۔

واجب الوجود (Necessary Being)

واجب الوجود کا مطلب ہے وہ وجود جس کا ہونا ضروری اور لازمی ہے، یعنی ایسا وجود جو اپنی ذات میں قائم ہو اور کسی دوسرے پر انحصار نہ کرے۔ فلسفہ اور علم کلام میں یہ اصطلاح اللہ تعالیٰ کے لیے استعمال ہوتی ہے، کیونکہ اللہ ہی وہ ہستی ہے جو ازل، ابدی اور خود وجودی ہے، اور تمام کائنات اسی کے وجود سے قائم ہے۔

واجب الوجود کی خصوصیات میں شامل ہیں:

1. ازلی اور ابدی: اس کا کوئی آغاز یا انجام نہیں۔
2. خود مختار: اس کا وجود کسی دوسرے پر منحصر نہیں۔
3. مطلق وجود: تمام موجودات کا وجود اس سے وابستہ ہے۔
4. ناقابل تغیر: اس میں کسی قسم کی تبدیلی یا فنا ممکن نہیں۔

محال (Impossible):

محال کا مطلب ہے وہ چیز جس کا وقوع کسی بھی حالت میں ممکن نہ ہو، چاہے عقل، عادت، یا شریعت کے اعتبار سے۔ محال کو تین اقسام میں تقسیم کیا جاتا ہے: محال بالذات، محال شرعی، اور محال عادی۔

1. محال بالذات (Intrinsically Impossible):

یہ وہ چیز ہے جس کا وجود عقلی طور پر ممکن نہ ہو اور جسے ماننا منطقی تضاد ہو۔ اس قسم کے محال کا تعلق اصولی اور منطقی دلائل سے ہے۔
مثال: ایک چیز کا بیک وقت موجود اور غیر موجود ہونا۔
ایک گول دائرہ جس کے کونے ہوں۔
وضاحت: محال بالذات وہ بنیادی محال ہے جس پر زیادہ تر فلسفیانہ اور علمی مباحث ہوتے ہیں۔ دیگر اقسام اکثر اسی کے تحت آتی ہیں۔

2. محال شرعی (Legally Impossible):

یہ وہ چیز ہے جو عقلی طور پر ممکن ہو لیکن شریعت نے اسے ناممکن یا باطل قرار دیا ہو۔ مثال کے طور پر: مشرک کا جنت میں جانا یا اللہ کے سوا کسی کو عبادت کے لائق سمجھنا۔

وضاحت: محال شرعی میں منطقی تضاد نہیں ہوتا، لیکن یہ شریعت کے فیصلوں کے خلاف ہوتا ہے، اس لیے اسے ناممکن سمجھا جاتا ہے۔

3. محال مادی (Customarily Impossible):

یہ وہ چیز ہے جو عادتاً ممکن نہ ہو لیکن عقلی اور شرعی طور پر ممکن ہو۔
مثال: انسان کا بغیر کسی آلے کے اڑنا مردے کا دوبارہ زندہ ہونا (معجزہ کے طور پر)۔

وضاحت: محال عادی عام طور پر عادت یا طبیعی اصولوں کے خلاف ہوتا ہے، لیکن قدرت الہی سے ممکن ہو سکتا ہے۔

خلاصہ: محال بالذات: منطقی طور پر ناممکن اور اصولی تضاد پر مبنی۔

محال شرعی: شریعت کے فیصلے کے خلاف، مگر عقلی طور پر ممکن۔

محال عادی: عادتاً ناممکن، مگر قدرت الہی سے ممکن۔

اسلامی عقائد اور فلسفے میں زیادہ تر مباحث محال بالذات پر ہوتے ہیں، کیونکہ یہی اصل محال ہے جو اللہ کی ذات اور صفات کی حقانیت کو واضح کرتا ہے۔

علت (Cause):

علت کا مطلب ہے وہ وجہ یا سبب جس سے کوئی چیز یا واقعہ وجود میں آتا ہے۔ ہر چیز جو وجود رکھتی ہے، اس کے پیچھے کوئی نہ کوئی علت ہوتی ہے۔

مثال: آگ علت ہے اور اس سے نکلنے والا دھواں اس کا اثر یا نتیجہ۔

معلول (Effect):

معلول وہ چیز ہے جو علت کے نتیجے میں وجود میں آتی ہے۔ یہ علت کا اثر یا

پیداوار ہوتی ہے۔

مثال: دھواں معلول ہے، کیونکہ یہ آگ (علت) کے نتیجے میں پیدا ہوتا ہے۔
خلاصہ: علت سبب ہے، اور معلول اس کا نتیجہ۔ دونوں کا تعلق ایک دوسرے سے گہرا ہے، یعنی بغیر علت کے معلول کا وجود ممکن نہیں۔

عقل پسندی (Rationalism):

عقل پسندی ایک نظریہ ہے جس میں عقل کو مذہب اور وحی پر فوقیت دی جاتی ہے، یعنی دینی احکام اور عقائد کو عقل کی کسوٹی پر پرکھا جاتا ہے۔ اس تصور کے تحت مذہبی حقائق کو قبول کرنے کے لیے عقل کی توثیق ضروری سمجھی جاتی ہے۔

اسلامی تناظر میں:

اسلام عقل کو ایک عظیم نعمت قرار دیتا ہے، لیکن اسے وحی کی رہنمائی کے تحت رکھتا ہے تاکہ انسان کی محدود سوچ درست سمت اختیار کرے۔ دینی معاملات میں عقل کے لیے وحی کا رہنما ہونا ضروری ہے۔ صرف عقل کو معیار بنانا، جیسا کہ عقل پسندی کا دعویٰ ہے، اسلامی عقیدے سے متصادم ہے، کیونکہ وحی انسان کی محدود عقل کو وہ رہنمائی فراہم کرتی ہے جو وہ خود نہیں حاصل کر سکتی۔

خلاصہ: عقل پسندی میں عقل کو مذہبی رہنمائی پر مقدم سمجھا جاتا ہے، جبکہ اسلام عقل کو وحی کے تابع مانتا ہے۔

نسبیت پسندی (Relativism):

نسبیت پسندی ایک نظریہ ہے جس کے مطابق علم، سچائی، اور اخلاقیات کا کوئی حتمی معیار نہیں ہوتا بلکہ یہ مختلف ثقافتوں، معاشروں، یا تاریخی حالات کے تحت بدلتے رہتے

ہیں۔ اس نظریے میں کوئی مطلق (Absolute) سچائی نہیں مانی جاتی، بلکہ ہر سچائی کو حالات کے مطابق دیکھا جاتا ہے۔ نسبیت پسندی کے تحت اخلاقیات اور حقائق بدلاؤ کے شکار ہو سکتے ہیں، جبکہ اسلام میں حقائق اور اخلاقی اصول مطلق اور ابدی ہیں، جو کسی انسانی حالات یا ثقافت سے مشروط نہیں۔

خلاصہ: نسبیت پسندی ہر چیز کو بدلاؤ کے اصول پر رکھتی ہے، جبکہ اسلام حق اور اخلاقیات کو مطلق اور الہامی مانتا ہے۔

شک پرستی (Scepticism)

شک پرستی ایک نظریہ یا رویہ ہے جس میں کسی بات یا حقیقت کو ماننے سے پہلے اس پر شک کیا جاتا ہے اور اس کی سچائی پر سوال اٹھایا جاتا ہے۔ فلسفے میں، یہ نظریہ بیان کرتا ہے کہ کسی بھی چیز کا حتمی اور یقینی علم حاصل کرنا ممکن نہیں۔

اسلامی تناظر میں: اسلام میں شک کی بجائے یقین اور ایمان پر زور دیا گیا ہے۔ قرآن ان لوگوں کی مذمت کرتا ہے جو واضح دلائل کے باوجود شک کرتے ہیں:

”یہ وہی لوگ ہیں جن کے دلوں میں شک ہے۔“ (سورۃ التوبہ: 45)

البتہ، اسلام تحقیق اور تدبر کی اجازت دیتا ہے، لیکن شک کو اس حد تک لے جانا کہ حقائق کو ہی رد کر دیا جائے، اسلام کے عقیدے سے متصادم ہے۔ خلاصہ: شک پرستی ہر حقیقت کو مشکوک سمجھتی ہے، جبکہ اسلام واضح دلائل کے ذریعے یقین کو مضبوط کرنے کی تعلیم دیتا ہے۔

دی ازم (Deism)

دی ازم ایک نظریہ ہے جس کے تحت ایک اعلیٰ خالق کے وجود کو مانا تو جاتا ہے،

لیکن یہ عقیدہ رکھا جاتا ہے کہ وہ خالق کائنات میں کسی قسم کی مداخلت نہیں کرتا۔
خلاصہ: دی ازم خدا کے وجود کو تسلیم کرتا ہے، لیکن اسے غیر مداخلت کرنے والا مانتا ہے، جو اسلام کے عقیدے کے برخلاف ہے کہ اللہ کائنات پر مکمل اختیار رکھتا ہے۔

ہیڈونزم (Hedonism)

ہیڈونزم وہ نظریہ ہے جس کے مطابق انسانی زندگی کا سب سے بڑا مقصد خوشی اور لذت کا حصول ہے۔ اس میں اپنی خواہشات کو پورا کرنے اور ذاتی لذت کو اولین ترجیح دی جاتی ہے، چاہے اس کے اخلاقی یا سماجی نتائج کچھ بھی ہوں۔
خلاصہ: ہیڈونزم خوشی کو انسانی زندگی کا اعلیٰ مقصد قرار دیتا ہے، جبکہ اسلام اخلاقی حدود کے تحت خوشی اور سکون کو اللہ کی رضا میں تلاش کرنے کی تعلیم دیتا ہے۔

پین تھی ازم (Pantheism)

پین تھی ازم ایک نظریہ ہے جو خدا کو کائنات کے ساتھ یکساں قرار دیتا ہے یا کائنات کو خدا کا ظہور سمجھتا ہے۔ اس کے تحت کائنات اور خدا میں کوئی فرق نہیں کیا جاتا۔
خلاصہ: پین تھی ازم خدا اور مخلوق کے درمیان فرق کو مٹا دیتا ہے، جبکہ اسلام خدا کو خالق اور کائنات کو مخلوق مانتا ہے، اور دونوں کو واضح طور پر جدا قرار دیتا ہے۔

الہیات اور الحاد کا بنیادی تصور

Theism ایک مختصر تعارف

اس سے پہلے کہ ہم الحاد (Atheism)، اس کی تاریخ، اسباب اور نتائج کو سمجھنے کی کوشش کریں، یہ ضروری ہے کہ پہلے الہیات (Theism) کو زیر بحث لایا جائے، کیونکہ حقائق کو ان کے اضداد کے ذریعے سمجھنا زیادہ آسان اور مؤثر ہوتا ہے۔ ”لان الأشياء تعرف باضدادا“ (چیزیں اپنے اضداد کے ذریعے پہچانی جاتی ہیں)۔

الہیات (Theism)

آکسفورڈ ڈکشنری آف انگلش کے مطابق:

تھیزم وہ عقیدہ ہے جس کے تحت خدا یا خداؤں کے وجود پر یقین رکھا جاتا ہے، خاص طور پر ایک ایسے خالق پر جو کائنات میں مداخلت کرتا ہو۔ الہیات کی مختلف شکلیں موجود ہیں، جو مختلف عقائد اور نظریات کے تحت خدا کے تصور کو بیان کرتی ہیں۔ یہ اصطلاح 17 ویں صدی کے آخر میں یونانی لفظ **theos** (خدا) اور لاحقہ **-ism** سے ماخوذ ہے۔

اس کی تفصیل کچھ یوں ہے کہ الہیات (Theism) ایک ایسا نظریہ ہے جس کے تحت یہ تسلیم کیا جاتا ہے کہ کائنات اور اس میں موجود تمام چیزیں ایک اعلیٰ اور حتمی حقیقت پر منحصر ہیں، جسے عام طور پر خدا کہا جاتا ہے۔ یہ مختلف مذاہب اور فلسفیانہ عقائد کو محیط کرتا ہے، خاص طور پر ابراہیمی مذاہب جیسے یہودیت، عیسائیت، اور اسلام۔ اس نظریے کا بنیادی نکتہ خدا کے وجود کو تسلیم کرنا ہے، اور پھر اس کے متعلق سوالات اٹھانا

جیسے: کیا خدا ایک ہے یا زیادہ؟ خدا کی صفات کیا ہیں؟ کیا خدا کو انسانوں کے ساتھ کوئی تعلق رکھنا چاہیے؟ کیا خدا سب کچھ دیکھتا اور سنتا ہے یا وہ صرف تخلیق کرنے والا ہے؟ یہ اور اسی طرح کے دیگر سوالات انسان کو خدا کے حقیقی تصور کو سمجھنے پر آمادہ کرتے ہیں۔ خدا کے وجود کو تسلیم کرنے کے بعد ہی مزید نظریات اور سوالات پیدا ہوتے ہیں۔

الہیات کی اقسام:

الہیات کو مختلف بنیادوں پر تقسیم کیا جاسکتا ہے:

1. خدا کی تعداد کے لحاظ سے:

وحدانیت (Monotheism): ایک خدا پر ایمان۔

تعددیت (Polytheism): کئی خداؤں پر ایمان۔

دوگانیت (Ditheism): دو خداؤں پر ایمان، عموماً ایک اچھا اور ایک برا۔

ہینوتھیزم (Henotheism): ایک بڑے خدا پر ایمان، ساتھ میں کئی چھوٹے

خدا بھی تسلیم کیے جاتے ہیں۔

2. خدا کی نوعیت کے لحاظ سے:

پینتھی ازم (Pantheism): خدا = کائنات یا ہر شے۔

دی ازم (Deism): خدا نے کائنات تخلیق کی، لیکن اس کے معاملات میں

مداخلت نہیں کرتا۔

آٹوتھی ازم (Autotheism): خدا = انسان کا نفس، یا خدا انسان کے اندر

موجود ہے۔

ایوتھی ازم (Eutheism): خدا سر اسرار رحم و انصاف پر مبنی ہے۔

میسوتھی ازم / ڈس تھی ازم (Misotheism/Dystheism): خدا کو برا یا

ظالم سمجھنا۔ (۱)

استحضار کو قبول کرنے کے بعد ہی یہ دیگر نظریات زیر بحث آتے ہیں اور مختلف مذاہب اور فلسفوں کے درمیان اختلافات واضح ہوتے ہیں۔

مثلاً، عیسائیت کہتی ہے کہ خدا کا ایک بیٹا ہے، جبکہ اسلام واضح طور پر اعلان کرتا ہے کہ خدا کا کوئی شریک یا اولاد نہیں۔ بعض فلسفی یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ خدا نے کائنات کی تخلیق کے بعد اس سے لائقیتی اختیار کر لی، جبکہ اسلام کا عقیدہ ہے کہ خدا ہر لمحہ کائنات پر نظر رکھتا اور اسے چلا رہا ہے۔ یہ اختلافات مقامی الہیات (Local Theism) کی مثال ہیں، جہاں ہر مذہب یا فلسفہ خدا کے بارے میں مخصوص تصورات پیش کرتا ہے۔

عالمی الہیات (Global Theism) کا تصور، جس میں تمام مذاہب کے خدا کے تصورات کو ایک ساتھ تسلیم کیا جائے، منطقی طور پر ناقابل عمل ہے، کیونکہ مختلف مذاہب کے تصورات ایک دوسرے سے متضاد ہیں۔

الہیات کو مان لینے کے بعد یہ سوالات انسانی عقل میں ابھرتے ہیں کہ خدائی صفات کیا ہیں، اس کے ساتھ انسان کا تعلق کیا ہونا چاہیے، اور اس کی عبادت کے اصول کیا ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ الہیات تمام فلسفیانہ اور مذہبی مباحث کی بنیاد ہے، کیونکہ خدا کے وجود کو تسلیم کیے بغیر اس کے متعلق تفصیلات پر بحث کرنا ممکن نہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ خدا کے وجود کو تسلیم کر لینا ہی الہیات (Theism) کہلاتا ہے، جبکہ اس کی تعداد، صفات اور کردار وغیرہ کی تعین میں اختلافات بعد کے مباحث ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ عقیدے میں خواہ کوئی خدا کا کوئی بیٹا تسلیم کرے، یا بہت سے خداؤں کو مانے، یا کسی انسان کو خدا کا مقام دے دے، یا ایک واحد خدا کو مانے، یہ

تمام تصورات الہیات کے دائرے میں آتے ہیں۔ الہیات کا بنیادی نکتہ خدا کے وجود کو تسلیم کرنا ہے، باقی تفصیلات اور اختلافات اس کی تشریح و توضیح کے مراحل میں زیر بحث آتے ہیں۔

الحاد (Atheism):

انگریزی زبان میں بعض اوقات کسی لفظ کے آغاز میں "A" کا اضافہ کرنے سے اس کا مفہوم منفی ہو جاتا ہے۔ چنانچہ، جب ہم Theism (الہیات) کے تصور کو سمجھ لیتے ہیں تو Atheism (الحاد) کو سمجھنا آسان ہو جاتا ہے، یعنی الحاد الہیات کا انکار ہے۔ آکسفورڈ ڈکشنری کے مطابق:

disbelief in the existence of God or gods

(خدا یا خداؤں کے وجود سے انکار یا ان پر یقین نہ رکھنا۔)

ڈاکٹر جولین بیجینی، جو خود ایک ملحد ہیں، الحاد کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

Atheism is the belief that there is no God or gods.

(الحاد یہ عقیدہ ہے کہ خدا یا خداؤں کا کوئی وجود نہیں ہے۔) (۱)

لیڈن یونیورسٹی، ہالینڈ کے پروفیسر پاول کلیٹیور لکھتے ہیں:

The most fruitful definition of Atheism is a negative one: an atheist does not believe in the God that Theism favours. (2)

(1) Baggini, Julian, Atheism: A Short Introduction, Pg. 03

(2) Cliteur, Paul, The Definition of Atheism, Journal of Religion and Society, Vol. 11, Pg. 01)

(الحاد کی سب سے مؤثر تعریف یہ ہے کہ ایک ملحد اس خدا پر یقین نہیں رکھتا جس پر الہیات زور دیتی ہے۔)
 پروفیسر ایلسٹر مگرا، جو خود ایک سابق ملحد رہ چکے ہیں، لکھتے ہیں:

Atheism is the religion of autonomous and rational human beings, who believe that reason is able to uncover and express the deepest truths of the universe, from mechanics of the rising sun to the nature and final destiny of humanity. (1)

(الحاد آزاد اور عقلی انسان کا مذہب ہے، جو یہ یقین رکھتا ہے کہ عقل کائنات کی گہری ترین حقیقتوں کو دریافت اور بیان کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے، چاہے وہ سورج کے طلوع ہونے کے طریقہ کار ہوں یا انسانیت کی نوعیت اور اس کا آخری مقدر۔)
 انسائیکلو پیڈیا بریٹینیکا میں الحاد کی وضاحت یوں کی گئی ہے:

"Atheism, however, casts a wider net and rejects all belief in spiritual beings and to the extent that belief in spiritual beings is definitive of what it means for a system to be religious, Atheism rejects religion.

(الحاد تمام روحانی ہستیوں پر یقین کو مسترد کرتا ہے، اور چونکہ روحانی ہستیوں پر یقین کسی مذہبی نظام کی وضاحت کے لیے اہم ہے، اس لیے الحاد مذہب کو بھی مسترد کرتا ہے۔)

(1) McGrath, The Twilight of Atheism. Double Day: A Division of Random House, Inc. Pg. 175

"So Atheism is not only a rejection of the central concepts of Judaism, Christianity, and Islam; it is, as well, a rejection of the religious beliefs of such African religions as that of the Dinka and the Nuer, of the anthropomorphic gods of classical Greece and Rome, and the transcendental conceptions of Hinduism and Buddhism. Generally, Atheism is a denial of God or of the gods, and if religion is defined in terms of disbelief in spiritual beings, then Atheism is the rejection of all religious belief."(1)

(لہذا، الحاد نہ صرف یہودیت، عیسائیت، اور اسلام کے مرکزی تصورات کو مسترد کرتا ہے بلکہ افریقی مذاہب جیسے دینکا اور نیور، کلاسیکی یونان اور روم کے انسانی صفات والے خداؤں، اور ہندو ازم و بدھ مت کے روحانی تصورات کو بھی رد کرتا ہے۔ عمومی طور پر الحاد خدا یا خداؤں کے انکار کا نام ہے، اور اگر مذہب کو روحانی ہستیوں پر یقین نہ رکھنے کے طور پر بیان کیا جائے تو الحاد تمام مذہبی عقائد کو مسترد کرتا ہے۔)

الحاد (Atheism) کو مختلف ادوار اور فلسفیانہ تناظر میں متنوع تعریفات کے ذریعے بیان کیا گیا ہے۔ پلویٹ ایک جگہ کہتے ہیں کہ ماہرین تعلیم اور فلسفیوں کے درمیان الحاد کی کوئی متفقہ تعریف طے نہیں ہو سکی ہے۔ تاہم، ان کا کہنا ہے کہ وہ

(1) <https://www.britannica.com/topic/atheism>

ان فلسفیانہ باریکیوں میں الجھنے کے بجائے عملی پہلو پر توجہ مرکوز کرتے ہیں۔ (۱)
لہذا ان تعریفات میں معمولی فرق موجود ہے، لیکن ان سب کا بنیادی مقصد ایک ہی ہے: خدائی وجود کو مکمل طور پر رد کرنا اور یہ دعویٰ کرنا کہ انسانی فلاح و بہبود کے لیے کسی خارجی وحی یا الہامی علم کی ضرورت نہیں۔ الحاد کا فلسفہ یہ ہے کہ انسانی عقل ان تمام مسائل کے حل کے لیے کافی ہے۔ اس میں انسان کو اپنی ذات کا خدا سمجھا جاتا ہے، جو کسی بیرونی رہنمائی یا روحانی وجود پر انحصار نہیں کرتا۔

خلاصہ: الحاد کا مرکزی عقیدہ یہ ہے کہ:

1. خدا کا انکار: الحاد کا مرکزی دعویٰ یہ ہے کہ خدا یا کسی بھی مافوق الفطرت ہستی کا کوئی وجود نہیں۔ کائنات کی تخلیق اور تمام مظاہر محض اتفاقات یا مادی اسباب کا نتیجہ ہیں، اور ان کے پیچھے کسی خالق کی مداخلت کو تسلیم نہیں کیا جاتا۔
2. انسانی خود مختاری: الحاد میں انسان کو اپنی زندگی کے تمام فیصلے اور اصول طے کرنے کا مکمل اختیار دیا جاتا ہے۔ ان کے نزدیک عقل اور شعور زندگی کی رہنمائی کے لیے کافی ہیں، اور کسی مذہب یا وحی کی ضرورت نہیں۔
3. وحی اور مذہب کا انکار: الحاد یہ نظریہ رکھتا ہے کہ تمام مذہبی عقائد اور وحی انسانی تخیل کی پیداوار ہیں۔ چونکہ یہ عقل کی حدود سے ماورا ہیں، اس لیے ان کا کوئی عملی یا سائنسی جواز نہیں ہے۔

4. اخلاقیات کا ماخذ: الحاد میں خیر و شر کے اصول انسانی عقل، ارتقاء کے اصولوں، اور معاشرتی معاہدوں پر مبنی ہیں۔ اخلاقیات کا کوئی مطلق معیار نہیں بلکہ یہ

(1) (Bullivant, S. 2015. Defining Atheism: In the Oxford Handbook of Atheism pp 11-21

نسبتی (relative) ہیں، جو حالات اور معاشرتی ضروریات کے مطابق تبدیل ہو سکتے ہیں۔

5. طبیعت پسندی (Naturalism): الحاد کی بنیاد طبیعت پسندی پر ہے، جو دعویٰ کرتی ہے کہ مادی دنیا کے علاوہ کوئی وجود نہیں رکھتا۔ فطری قوانین ہی سب کچھ ہیں، اور کسی ماورائے فطرت (supernatural) ہستی یا واقعے کو رد کر دیا جاتا ہے۔

الحاد کی مختصر تاریخ اور اس کے اسباب

الحاد کی تاریخی ترتیب

الحاد کی تاریخ کا آغاز ہزاروں سال قبل ہوتا ہے، جب کہ الحاد کے سہولت کار فلسفے مثلاً سوفسطائیت، تجربیت پرستی، عقلیت پرستی، اور تشکیک (Agnosticism) تقریباً 2500 سے 3000 سال سے موجود ہیں۔ ابتدائی ادوار میں یہ خیالات انفرادی سطح پر موجود تھے، اور کسی معاشرتی یا ریاستی نظام میں شامل نہیں تھے۔ ان ادوار میں کوئی شخص کھلے عام اپنے آپ کو ملحد کہنے سے گریز کرتا تھا کیونکہ اس وقت مذہبی انکوزیشن (Inquisition) کا خوف موجود تھا۔

الحاد کا کھلا اظہار

الحاد کا کھلے عام اظہار اٹھارویں صدی سے شروع ہوا۔ خاص طور پر فرانس اور برطانیہ میں اس نے اپنے اثرات مرتب کیے۔ فرانس میں پہلا اعلان شدہ ملحد بیرن ڈی ہالباخ (Baron d'Holbach) تھا، جس کی کتاب نظام حیات (System of

(Nature) 1770 میں شائع ہوئی۔ یہ کتاب الحاد کی فلسفیانہ بنیاد فراہم کرنے میں نمایاں رہی۔

برطانیہ میں الحاد کی تاریخ کے حوالے سے ڈیوڈ برمن (David Berman) لکھتا ہے:

I now turn to the history of overt Atheism in Britain and to the first avowedly atheistic book which was 'Answer to Dr. Priestly's Letters to a Philosophical Unbeliever' (London, 1782)." (1)

اس کتاب کے مصنف کے بارے میں اختلاف پایا جاتا ہے، بعض کے مطابق یہ میتھیو ٹرنر (Matthew Turner) اور بعض کے مطابق ولیم ہیمنڈ (William Hammon) ہیں۔ کتاب میں مصنف لکھتا ہے:

"But as to the question whether there is such an existent being as an atheist, to put that out of all manner of doubt, I do declare upon my honour that I am one ." (2)

ترجمہ۔ ”لیکن جہاں تک اس سوال کا تعلق ہے کہ آیا ایک ایسا وجود رکھنے والا شخص بھی موجود ہے جو ملحد ہو، تو اس شک کو مکمل طور پر ختم کرنے کے لیے، میں پورے خلوص کے ساتھ یہ اعلان کرتا ہوں کہ میں ایک ملحد ہوں۔“

(1) A History of Atheism in Britain, Pg. 110

(2) Answer to Dr. Priestly's Letters to a Philosophical Unbeliever, Pg. 17

الحاد کی تحریک کا ارتقاء

الحاد مختلف ادوار میں مختلف شکلوں میں ظاہر ہوا۔ کبھی یہ یونانی فلسفیوں کے خیالات میں نظر آیا، کبھی عصرِ روشن خیالی (Enlightenment) میں سائنسی بنیادوں پر استوار ہوا، اور کبھی یہ مارکسزم اور کمیونزم کی شکل میں ریاستی نظام میں تبدیل ہو گیا۔ ان تمام مراحل میں الحاد نے ایک بنیادی اصول برقرار رکھا: خدا کے وجود اور الہامی علم کا انکار۔

اسلامی عقائد پر غور کرنے سے واضح ہوتا ہے کہ انسانی عقل کو دو مختلف زاویوں سے استعمال کیا گیا: ایک وہ جہاں عقل کو وحی سے آزاد کر کے خود مختاری دی گئی، اور دوسرا وہ جہاں عقل کو وحی کے تابع رکھا گیا تاکہ دین کے دفاع اور وضاحت کے لیے استعمال کیا جاسکے۔ پہلا زاویہ فلسفہ کہلاتا ہے، جو بنیادی طور پر یونانی مفکرین جیسے ارسطو اور افلاطون کے اصولوں سے متاثر تھا۔ اس میں انسانی عقل کو حتمی معیار مانتے ہوئے، خود ساختہ اصولوں کی بنیاد پر کائنات اور حقیقت کی وضاحت کی گئی۔ فلسفے نے وحی کو غیر ضروری یا محدود قرار دے کر انسان کو اپنی ذات کا خدا بنادیا۔ نتیجتاً، ایسے نظریات وجود میں آئے جو اسلامی تعلیمات سے متصادم تھے۔ فلسفہ نے عقل کو ایسی جگہ پر لا کھڑا کیا جہاں وہ اپنی محدودیت کی بنا پر گمراہی کا شکار ہو گئی۔

دوسری طرف، کلام کا زاویہ وحی کو مرکزی حیثیت دیتا ہے اور عقل کو اس کا تابع رکھتا ہے۔ کلام نے اسلامی عقائد کا دفاع کرنے اور اسلام کے خلاف پیش کیے جانے والے اعتراضات کا عقلی جواب فراہم کرنے کا بیڑہ اٹھایا۔ عقل کو کلام میں ایک آلے کے طور پر استعمال کیا گیا، لیکن یہ آلہ وحی کے اصولوں کے مطابق تھا۔ کلام نے فلسفیانہ

اعتراضات کو رد کرتے ہوئے اسلامی تعلیمات کو مضبوط دلائل کے ساتھ پیش کیا اور یہ ثابت کیا کہ عقل، وحی کے بغیر ناقص ہے۔

کلام کے آغاز میں دو رجحانات نمایاں تھے: ایک وہ جو یونانی فلسفے کے اصولوں کو شامل کر کے ان کے ذریعے اسلامی عقائد کا دفاع کرتا تھا، اور دوسرا وہ جو فلسفے کو مسترد کر کے صرف قرآن و سنت کی روشنی میں دلائل فراہم کرتا تھا۔ وقت کے ساتھ، کلام کو اہل سنت کے عقائد کی وضاحت کے لیے مخصوص کر دیا گیا۔

فلسفہ ایسی عقل کو فروغ دیتا ہے جو اپنے اصولوں کے گرد گھومتی ہے اور حقیقت تک پہنچنے میں ناکام رہتی ہے، جبکہ کلام عقل اور وحی کے درمیان توازن قائم کر کے اسلام کو مضبوط فکری بنیاد فراہم کرتا ہے۔

امام غزالی رحمہ اللہ نے اس موضوع پر نہایت جامع بات کی ہے اور عقل و وحی کے تعلق کو واضح کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں:

"ظن من یظن ان العلوم العقلیة مناقضة للعلوم

الشرعیة وان الجمع بینہما غیر ممکن ہو ظن صادر عن

عمی فی عین البصیرة نعوذ باللہ منه"۔ (۱)

یعنی، جو شخص یہ گمان کرتا ہے کہ عقلی علوم شریعت کے علوم کے مخالف ہیں اور ان دونوں کا جمع ہونا ممکن نہیں، وہ شخص بصیرت کی آنکھوں کے اندھے پن کا شکار ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اس سے محفوظ رکھے۔

اسلام کا پیغام یہ ہے کہ عقل کو وحی کے تابع رکھا جائے تاکہ یہ گمراہی سے بچ سکے اور انسان کو حقیقت کی صحیح سمت میں رہنمائی فراہم کرے۔ یہی توازن اسلامی فکری نظام کو

دیگر نظریات سے ممتاز کرتا ہے اور الحاد کے مقابلے میں اسلام کو ایک مضبوط علمی دفاع فراہم کرتا ہے۔

الحاد ایک اہم فکری اور سماجی خطرہ اس وقت تک نہیں سمجھا گیا جب تک کہ نویں صدی عیسوی میں ”دہریہ“ کی تحریک سامنے نہیں آئی۔ دہریوں کا نظریہ یہ تھا کہ تمام علم صرف تجرباتی طریقے سے حاصل کیا جاسکتا ہے۔ وہ کائنات کو ازلی اور چار بنیادی خواص پر مبنی سمجھتے تھے، جو ہر موجود چیز کی تشکیل کا سبب ہیں۔ ان کے مطابق، ہر چیز ہمیشہ سے موجود ہے اور اسے کسی خالق یا صانع کی ضرورت نہیں۔ (۱)

کتاب الاغانی میں ابو الفرج الاصفہانی نے ذکر کیا ہے کہ امام ابو حنیفہؒ، جو مشہور فقیہ اور حنفی فقہ کے بانی ہیں، نے آٹھویں صدی میں ایک دہریہ کے ساتھ مناظرہ کیا۔ امام ابو حنیفہؒ نے دہریوں کے دلائل کو زبردست علمی انداز میں رد کیا اور ان کے نظریات کو عوامی بحثوں میں شکست دی۔

دہریہ کے دعوؤں کا جواب دینے والے اسلامی علماء میں امام غزالیؒ، ابن جوزیؒ، الجاحظؒ، محمد بن شیبہؒ، ابن قتیبہؒ، اور ابو عیسیٰ الوراقؒ جیسے مشاہیر شامل ہیں۔ امام غزالیؒ اپنی کتاب ”کیمیائے سعادت“ میں دہریوں کو ”تحلیل پسند“ (Reductionists) قرار دیتے ہیں، جن کی سوچ محدود اور کائنات کے مقصد کے بارے میں غیر جامع ہے۔ ان کے مطابق دہریے اس چیونٹی کی مانند ہیں جو کاغذ پر لکیر دیکھ کر یہ سمجھتی ہے کہ وہ خود بخود بنی ہے اور اس قلم یا لکھنے والے کو نہیں دیکھ پاتی جو اسے لکھ رہا ہے۔

اسلامی تاریخ میں الحاد کے ساتھ مباحثہ اور مکالمہ ہمیشہ ایک ایسے ماحول میں ہوا

جہاں باہمی احترام اور برداشت کو یقینی بنایا گیا۔

اسلامی مفکر ڈاکٹر جعفر ادیس اس حوالے سے اسلام کے اصول کو یوں بیان کرتے ہیں:
 ”غیر اسلامی عقائد کے ساتھ پر امن رہنا اسلام کا بنیادی اصول ہے، جو قرآن کی
 بہت سی آیات میں واضح طور پر بیان کیا گیا ہے اور مسلمانوں کی تاریخ میں ہمیشہ سے
 اس پر عمل کیا گیا ہے۔ یہ کوئی ایسی چیز نہیں جو مسلمانوں پر کسی دباؤ کے تحت مسلط کی گئی
 ہو بلکہ یہ اسلام کی فطرت کا تقاضا ہے۔“ (۱)

مغرب میں الحاد کی تاریخ

مغربی تاریخ میں الحاد کو کبھی مقبول تحریک یا وسیع پیمانے پر پزیرائی نہیں ملی۔
 قدیم زمانوں میں الحاد کو باقاعدہ تحریک کے طور پر نہیں دیکھا گیا بلکہ بعض افراد یا
 فلسفیوں نے اس پر بحث کی، جنہوں نے دیوتاؤں کے وجود پر شک ظاہر کیا یا انکار
 کیا۔ یہ افراد عموماً اپنی نظریات کو عملی جامہ پہنانے کی کوشش نہیں کرتے تھے، بلکہ
 مذہبی عمل کو مسترد کرنے کی حد تک محدود رہتے تھے۔

پہلی بار **Atheism** کی اصطلاح یونانی عالم سر جان چیک نے اپنے ترجمے **On**
Superstition میں استعمال کی۔ بعد ازاں، فرانس میں 1600 کی دہائی میں،
 الحاد کے خلاف شدید علمی اور سماجی رد عمل دیکھنے کو ملا۔ 1700 کی دہائی تک برطانیہ میں
 الحاد کو خطرہ سمجھا گیا۔ مشہور مصنف جوزف ایڈلسن نے اپنی کتاب **The Evidence**
of the Christian Religion میں الحاد کو مضحکہ خیز اور غیر منطقی قرار دیا، اور
 اسے عقلی اور فطری سوچ کے خلاف قرار دیا۔

1700 اور 1800 کی دہائیوں میں فلسفیوں نے الحاد کو فروغ دینے میں اہم کردار ادا کیا۔ ڈیوڈ ہیوم اور ولٹیئر جیسے فلسفیوں نے مذہب اور خدا کے خلاف عقلی دلائل دیے۔ خاص طور پر ہیوم نے خدا کے وجود اور معجزات کو چیلنج کیا۔ ہیوم نے دلیل دی کہ دنیا میں شر اور دکھ کی موجودگی مذہب کے تصور کو چیلنج کرتی ہے۔ ان دلائل نے الحاد کو ایک نظریے کے طور پر پروان چڑھانے میں اہم کردار ادا کیا۔

جدید الحادی تحریک

انیسویں صدی میں چارلس بریڈلاف ایک اہم شخصیت کے طور پر ابھرے۔ وہ برطانوی پارلیمنٹ کے رکن تھے اور انہوں نے الحاد کو سماج میں قابل قبول بنانے کے لیے جدوجہد کی۔ ان کے خیالات کا محور یہ تھا کہ الحاد انسانیت کی خوشی اور ترقی کا ذریعہ بن سکتا ہے۔ بریڈلاف کی تحریریں، اس بات پر زور دیتی ہیں کہ مذہب کا انکار سماجی بہبود کے لیے بہتر ہے۔

1920 کی دہائی میں منطقی اثباتیت (logical positivism) کا آغاز ہوا۔ یہ فلسفیانہ تحریک سائنس کی کامیابیوں سے متاثر ہو کر یہ دعویٰ کرتی تھی کہ صرف وہی بات معنی رکھتی ہے جو تجربے کے ذریعے ثابت کی جاسکے۔ اس تحریک نے خدا، اخلاقیات، اور مابعد الطبیعیات (metaphysics) جیسے موضوعات کو "بے معنی" قرار دیا، کیونکہ یہ موضوعات تجرباتی بنیاد پر ثابت نہیں کیے جاسکتے۔

1960 کے بعد، منطقی اثباتیت کا زوال ہوا کیونکہ اس کا اپنا معیار بے معنی ثابت ہوا۔ اس کے بعد، علمی حلقوں میں الحاد کے بارے میں دوبارہ بحث شروع ہوئی۔ Time میگزین نے 1980 میں لکھا: "خدا کے وجود پر مباحثے میں دوبارہ جان پڑ

رہی ہے۔" بیسویں صدی کی سائنسی دریافتوں جیسے بگ بینک اور کائنات کی فائن ٹونگ نے خدا کے تصور کو علمی اور فلسفیانہ مباحث میں دوبارہ اہمیت دی۔ (۱)
ان تمام باتوں کے باوجود یہ حقیقت ناقابل انکار ہے کہ الحاد تیزی سے پھیل رہا ہے، خاص طور پر "نیو اتھیزم" تحریک نے اس میں نئی روح پھونکی۔ اس تحریک کے مرکزی رہنمایا سر کردہ شخصیات میں رچرڈ ڈاکنز، ڈینیل ڈینٹ، سیم ہیریس، اور کرسٹوفر پیچز شامل ہیں۔

کرسٹوفر پیچز اپنے نظریے کو یوں بیان کرتے ہیں:

Religion poisons everything. (2)

یعنی "مذہب ہر چیز کو زہر آلود کر دیتا ہے۔"

سیم ہیریس نے کہا: "The days of our religious identities"

are clearly numbered

یعنی "مذہبی شناخت کے دن اب گنے جا چکے ہیں۔"

رچرڈ ڈاکنز اپنے کتاب "The God Delusion" میں لکھتے ہیں:

God is delusional یعنی "خدا کا تصور سراسر دھوکہ ہے (۳)

لیکن یہاں یہ بات بھی قابل غور ہے کہ خود ملحدین اس "نیو اتھیزم" تحریک کے

خلاف آواز اٹھاتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ فلسفی ٹم کرین اپنی کتاب "A Skeptic's

Guide to Atheism" میں لکھتے ہیں:

(1) Hamza Andreas Tzortzis, The Divine Reality, Pg 25-29

(2) God is not Great, pg 13

(3) The God Delusion pg 20

"It seems to me that many of the claims made by the new atheists are simply not true and that their view of the role of Religion in worldly affairs is in many ways mistaken. Going on in this way about Religion is not a very sensible approach to tackling the problems of the world. It is surprisingly difficult to change people's beliefs. But if there is one thing which should be obvious here, it is that the way to do it (generally) is not to tell them that they are stupid, irrational or hopelessly ignorant". (1)

یعنی، "میرے نزدیک نیو ایٹھسٹ کے کئی دعوے درست نہیں ہیں، اور ان کا مذہب کے دنیاوی معاملات میں کردار پر نظریہ کئی پہلوؤں سے غلط ہے۔ اس انداز میں مذہب کے بارے میں بات کرنا دنیا کے مسائل حل کرنے کا کوئی معقول طریقہ نہیں۔ لوگوں کے عقائد کو تبدیل کرنا حیرت انگیز طور پر مشکل ہے، لیکن اگر کوئی بات یہاں واضح ہونی چاہیے، تو وہ یہ ہے کہ ان سے یہ کہنا کہ وہ بے وقوف، غیر منطقی یا لاعلم ہیں، ان کے عقائد کو بدلنے کا کوئی درست طریقہ نہیں۔"

الحاد کے پھیلاؤ کے حوالے سے مختلف رپورٹس میں یہ واضح ہوتا ہے کہ دنیا کے کئی ممالک میں الحاد کے پیروکاروں کی تعداد میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے۔ مثال کے طور

پر، چین، جاپان، اور روس جیسے ممالک میں الحاد کی شرح نمایاں طور پر زیادہ ہے۔ خاص طور پر جاپان میں الحاد یا لادینیت کا تناسب ۶۴ سے ۶۵ فیصد کے درمیان ہے، جب کہ روس میں یہ شرح ۲۴ سے ۴۸ فیصد تک پہنچ چکی ہے۔ یورپ میں فرانس اور جرمنی جیسے ممالک میں الحاد کے پیروکاروں کی بڑی تعداد موجود ہے، جہاں لاکھوں افراد خدا کے وجود یا کسی روحانی قوت پر یقین نہیں رکھتے۔

درحقیقت ایک رپورٹ کے مطابق دنیا میں پیروکاروں کی تعداد کے لحاظ سے بڑے مذاہب میں عیسائیت 2.1 ارب کے ساتھ پہلے نمبر پر ہے، اسلام 1.5 ارب کے ساتھ دوسرے نمبر پر، جب کہ تیسرے نمبر پر سیکولر، ایگناسٹک اور ملحدین کا گروپ ہے جن کی تعداد حیران کن طور پر 1.1 ارب تک پہنچ چکی ہے۔

یہ اعداد و شمار اس بات کی عکاسی کرتے ہیں کہ الحاد اور سیکولر نظریات عالمی سطح پر ایک بڑا چیلنج بن چکے ہیں۔ اگرچہ اسلام اور عیسائیت دنیا کے بڑے مذاہب ہیں، لیکن الحاد اور لادینیت کے فروغ نے ان مذاہب کے پیروکاروں کے لیے فکری اور اعتقادی خطرات پیدا کر دیے ہیں۔ اس لیے امت مسلمہ کو چاہیے کہ وہ اس بڑھتے ہوئے الحادی رجحان کا بھرپور مقابلہ کرنے کے لیے فکری و علمی تیاری کرے اور اسلام کی حقیقی تعلیمات کو دنیا کے سامنے پیش کرے تاکہ اس بڑھتے ہوئے خطرے کو کم کیا جاسکے۔ (۱)

چونکہ اس کتاب کا مقصد الحاد کی تاریخ کی تفصیلات بیان کرنا نہیں ہے، بلکہ الحادی نظریات کے اعتراضات کا عقلی اور نقلی دلائل کے ذریعے جواب دینا ہے، اس لیے میں یہاں اس بحث کو ختم کرتا ہوں۔

الحاد کی ابتدا کس سے کیسے اور کیوں؟

اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق کے بعد تمام فرشتوں اور ابلیس کو حکم دیا کہ وہ تعظیمی سجدہ کریں۔ فرشتوں نے فوراً اس حکم کی تعمیل کی، لیکن ابلیس نے اپنے غرور، حسد، اور تکبر کے باعث اس حکم کو رد کر دیا۔ اس نے اپنی عقل کو خدا کے حکم کے مقابلے میں فوقیت دی اور اپنے انکار کو عقلی بنیادوں پر جواز فراہم کرنے کی کوشش کی۔ اس کا کہنا تھا کہ وہ آگ سے بنا ہے جبکہ آدم مٹی سے بنے ہیں، لہذا ایک ”برتر مخلوق“ کو ایک ”کمتر مخلوق“ کے سامنے کیوں جھکنا چاہیے۔

یہ رویہ الحاد کی جڑوں کو سمجھنے کے لیے ایک اہم نقطہ فراہم کرتا ہے:

1. عقل کو وحی پر فوقیت دینا:

شیطان کی سب سے بڑی غلطی یہ تھی کہ اس نے خدا کے حکم کے مقابلے میں اپنی محدود عقل کو ترجیح دی۔ حالانکہ عقل بھی اللہ کی عطا کردہ نعمت ہے اور اس کا کام وحی کی تصدیق اور تعمیل کرنا ہے، نہ کہ اسے چیلنج کرنا۔ عقل کا دائرہ محدود ہے اور وہ صرف وہی نتائج اخذ کر سکتی ہے جو اسے دیے گئے ڈیٹا پر مبنی ہوں۔ جب انسان اپنی محدود عقل کو خدا کے لامحدود علم کے مقابلے میں کھڑا کرتا ہے تو یہ غرور اور گمراہی کا راستہ کھول دیتا ہے۔

2. غلط تقابل کرنا:

شیطان نے مٹی اور آگ کا تقابل کیا، جو کہ منطقی طور پر غلط تھا۔ دو مختلف انواع کا تقابل کرنا، جو اپنی نوعیت اور مقصد میں مختلف ہوں، غیر عقلی ہے۔ ہر مخلوق اپنے مقصد

اور وظیفے کے لحاظ سے اپنی جگہ منفرد اور محترم ہے۔

3. افضلیت کا مغالطہ:

شیطان نے آگ کو مٹی سے برتر سمجھا، حالانکہ دونوں عناصر اپنے اپنے مقاصد میں اہم ہیں۔ افضلیت کا یہ معیار خود ساختہ تھا اور اس نے شیطان کو حقیقت سے دور کر دیا۔

شیطان کا عبرتناک انجام عقل کی حدود اور حسد کا سبق

شیطان، جو کہ علم کے ایک بلند درجے پر فائز تھا، اپنے غرور، حسد اور عقل کو خدا کے حکم پر فوقیت دینے کے باعث گمراہ ہوا۔ اس کی مثال اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ خواہ انسان کتنے ہی علم و فضل کا دعویٰ کرے، اگر وہ اپنی عقل کو وحی اور خدا کی ہدایت سے بالاتر سمجھنے لگے، تو وہ حقیقت کو دیکھنے اور سمجھنے سے قاصر رہتا ہے۔ شیطان کا علم بھی اسے گمراہی سے نہیں بچا سکا، بلکہ اس کے تکبر اور حسد نے اس کے زوال کی بنیاد رکھی۔

شیطان نے اپنی ضد اور حسد کے باعث نہ صرف خود کو گمراہ کیا بلکہ اس نے بنی آدم کو بھی گمراہ کرنے کا عزم کر لیا۔ اس کا ایک بڑا حربہ یہ تھا کہ وہ انسان کو عقل کے غلط استعمال کی طرف مائل کرے اور خدا کی ذات پر سوالات پیدا کر کے شک اور گمراہی کے بیج بوئے۔ جیسا کہ حدیث میں آیا ہے:

"يَأْتِي الشَّيْطَانُ أَحَدَكُمْ فَيَقُولُ: مَنْ خَلَقَ كَذَا، مَنْ خَلَقَ

كَذَا حَتَّى يَقُولَ مَنْ خَلَقَ رَبُّكَ" - (۱)

اس حدیث سے ظاہر ہوتا ہے کہ شیطان انسان کو پہلے ان چیزوں کے بارے میں سوالات کرنے پر آمادہ کرتا ہے جن کے جوابات اس کے علم میں ہوتے ہیں۔ پھر وہ ان سوالات کی طرف لے جاتا ہے جن کا علم اس کی عقل کی پہنچ سے باہر ہے۔ اور جب انسان ان سوالات کو محض عقل کے ترازو پر تولنے کی کوشش کرتا ہے تو گمراہی کے سوا کچھ ہاتھ نہیں آتا۔

شیطان کی سب سے بڑی غلطی اس کا حسد اور تکبر تھا۔ حسد نے اسے حقیقت سے اندھا کر دیا، اور وہ یہ بھول گیا کہ خدا کے احکامات ہمیشہ حکمت پر مبنی ہوتے ہیں۔ شیطان نے اپنی عقل کے ذریعے خدا کے حکم کو چیلنج کیا، حالانکہ یہ عقل بھی خدا کی عطا کردہ تھی۔ یہی وجہ ہے کہ شیطان کو قرآن میں ”رجیم“ کہا گیا، یعنی دھتکارا ہوا اور اللہ کی رحمت سے دور کر دیا گیا۔

شیطان کا واقعہ نہ صرف ماضی کا ایک سبق ہے بلکہ موجودہ الحادی سوچ اور رویوں سے گہری مطابقت رکھتا ہے۔ آج کے ملحدین بھی اسی غلطی کے شکار ہیں جو شیطان نے کی تھی: عقل کو خدا اور وحی پر فوقیت دینا۔ ان کے رویوں اور افکار کا بغور جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ انہی بنیادوں پر کھڑے ہیں جنہوں نے شیطان کو گمراہی کے گڑھے میں دھکیلا تھا۔

الحاد کی طرف بڑھتے رجحان کے اسباب

آج کے دور میں الحاد اور دین سے دوری کا رجحان تیزی سے بڑھ رہا ہے۔ یہ مسئلہ صرف عقیدے کا نہیں بلکہ انسان کی فطرت، خواہشات اور سماجی رویوں کا نتیجہ ہے۔ ذیل میں وہ اہم وجوہات بیان کی گئی ہیں جو انسان کو الحاد کی طرف لے جاتی ہیں:

1. نفس پرستی اور مطلق آزادی کی خواہش

انسان کا اپنے نفس کی پیروی کرنا اور ہر قسم کی پابندی سے آزادی کا خواہاں ہونا الحاد کے بڑھنے کی ایک بنیادی وجہ ہے۔ جب انسان یہ سمجھتا ہے کہ مذہب اور خدا کے وجود کو ماننے سے اس پر کچھ ذمہ داریاں اور حدود عائد ہوتی ہیں، تو وہ اس سے فرار کی راہ اختیار کرتا ہے۔

مثال کے طور پر، ایک نوجوان جو اپنی خواہشات کو ہر حال میں پورا کرنا چاہتا ہے، دین کو اس کی راہ میں رکاوٹ سمجھتا ہے اور مذہب کے انکار کو اپنی آزادی کا ذریعہ قرار دیتا ہے۔

2. دین کی غلط نمائندگی

بعض اوقات مذہب کے نام پر سختی، جبر اور نفرت کو فروغ دیا جاتا ہے۔ جب لوگ مذہب کو اس کی اصل تعلیمات کی بجائے مذہبی رہنماؤں کے غلط رویوں کے ذریعے دیکھتے ہیں، تو وہ دین سے بدظن ہو جاتے ہیں۔ ایسے میں وہ مذہب کو ظلم اور دقتا نویسیت کا ذریعہ سمجھ کر اسے ترک کر دیتے ہیں۔

3. دنیاوی کامیابی اور مادیت پرستی

آج کے دور میں انسان کی توجہ دنیاوی کامیابی، دولت اور شہرت پر مرکوز ہو چکی ہے۔ وہ مادیت پرستی کو زندگی کا اصل مقصد سمجھنے لگتا ہے۔ ایسے میں خدا اور آخرت کے تصور کو غیر ضروری اور فرسودہ قرار دیا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر، ایک کامیاب کاروباری شخص جو اپنی دولت اور کامیابی کو اپنی محنت کا نتیجہ سمجھتا ہے، خدا کی طرف رجوع کرنے کو غیر اہم سمجھتا ہے۔

4. سائنس اور دین کے درمیان غلط فہمی

بہت سے لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ سائنس اور دین ایک دوسرے کے مخالف ہیں، حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ سائنس خدا کی تخلیق کے پیچیدہ نظام کی گواہی دیتی ہے۔ الحادی تحریکات نے اس تصور کو فروغ دیا کہ سائنسی ترقی دین کے عقائد کے خلاف ہے، جو لوگوں کو دین سے دور کرنے کا باعث بنتا ہے۔

5. مشکلات اور دکھوں پر شکوہ

دنیا میں موجود نا انصافی، ظلم، اور مصیبتیں اکثر انسان کو خدا کے وجود پر سوال اٹھانے پر مجبور کر دیتی ہیں۔ وہ یہ سوچنے لگتا ہے کہ اگر خدا موجود ہے تو دنیا میں یہ تمام دکھ، تکالیف، اور مسائل کیوں ہیں؟ مثال کے طور پر، ایک شخص جو قدرتی آفت میں اپنے خاندان کو کھو دیتا ہے، خدا کے انصاف اور اس کی رحمت پر شکوک کا شکار ہو سکتا ہے۔ ایسے لمحات میں، جذبات اور غم انسان کے شعور پر غالب آ جاتے ہیں، اور وہ حقیقت کو دیکھنے سے قاصر ہو جاتا ہے۔

وجودِ شر (Existence of Evil) اور اس کے اثرات

ہم دیکھتے ہیں کہ کئی افراد، خاص طور پر وہ جو اسلام یا کسی بھی مذہب کو ترک کرتے ہیں، وہ ماضی میں کسی نہ کسی بڑے صدمے یا تکلیف سے گزر چکے ہوتے ہیں۔ یہ صدمہ انہیں اس نتیجے پر پہنچاتا ہے کہ خدا کا وجود ممکن نہیں، کیونکہ وہ اس تکلیف یا ظلم کو خدا کی مرضی یا اس کے نظام کے خلاف سمجھتے ہیں۔

یہ کیفیت، جسے فلسفے میں ”وجودِ شر“ کے مسئلے سے تعبیر کیا جاتا ہے، انسان کے لیے ایک بڑا چیلنج بن جاتی ہے۔ یہ وہ لمحہ ہوتا ہے جب شخص کا دل اور دماغ حقیقت اور

جذبات کے درمیان معلق ہو جاتا ہے۔ جدید ذہن پہلے ہی خدا سے متعلق غلط فہمیوں اور اشکالات میں الجھا ہوا ہوتا ہے۔ اگر ان پر کوئی بڑی مصیبت آن پڑے، دعا قبول نہ ہو یا کسی تکلیف دہ صورت حال کا سامنا کرنا پڑے، تو وہ خدا سے انحراف کرنے پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔ ایسا ہی ایک واقعہ پاکستان میں پیش آیا، جہاں ایک شخص کو الحاد کے فروغ کا ذریعہ بنایا گیا۔ تحقیق کرنے پر معلوم ہوا کہ اس کی بیٹی ایک بم دھماکے میں جان سے ہاتھ دھو بیٹھی تھی۔ اس ناقابل برداشت صدمے نے اسے ذہنی اور روحانی طور پر اس حد تک متاثر کیا کہ اس نے اس نقصان کا تمام الزام خدا پر ڈال دیا اور اس کے دل سے ایمان کا چراغ بجھ گیا۔ اس قسم کے درجنوں واقعات مل جائیں گے، جہاں ذاتی غم یا تکلیف خدا سے دوری کا باعث بن گئی۔

ایسے افراد کو سب سے پہلے جذباتی اور نفسیاتی طور پر مدد فراہم کرنا ضروری ہے، کیونکہ جب تک وہ اپنے صدمے سے باہر نہیں آئیں گے، وہ کسی منطقی یا عقلی دلیل کو قبول کرنے کے قابل نہیں ہوں گے۔

صدمے سے نکلنے کا عمل

ایسے لوگوں کو دلائل دینے سے پہلے ان کے غم اور تکلیف کو سمجھنا اور ان کے ساتھ ہمدردی کرنا ضروری ہے۔ انہیں یہ باور کرانا کہ ان کے دکھ اور مسائل کو محسوس کیا جا رہا ہے، ان کے دل کو نرم کر سکتا ہے۔ جب وہ جذباتی سکون حاصل کر لیں، تو انہیں دھیرے دھیرے اور محبت کے ساتھ اس حقیقت سے روشناس کرایا جائے کہ دنیا میں موجود مشکلات ایک وسیع تر الہی حکمت کا حصہ ہیں۔

لہذا، ایسے افراد کے ساتھ ایک ماہر نفسیات یا ایک ہمدرد رہنما کی طرح پیش آنا

ضروری ہے، جو ان کی جذباتی حالت کو سمجھ سکے اور انہیں اس صدمے سے نکال سکے۔ اس کے بعد ہی وہ حقیقت کو دیکھنے اور سمجھنے کے قابل ہوں گے۔

6. مغربی نظریات کا اثر

سیکولرزم، لبرلزم، اور ہیومنزم جیسے نظریات نے انسان کو خدا سے بے نیاز کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہ نظریات انسان کو اپنی زندگی کا مرکز بناتے ہیں اور کسی الہی ہدایت یا احتساب کو غیر ضروری قرار دیتے ہیں۔

7. سوشل میڈیا اور الحادی پروپیگنڈا

میڈیا اور سوشل میڈیا الحاد کے پھیلاؤ میں اہم کردار ادا کر رہے ہیں۔ سوشل میڈیا پر الحادی نظریات بڑے منظم انداز میں پیش کیے جاتے ہیں، جن میں مذہب مخالف خیالات کو جذباتی اور پرکشش انداز میں نوجوان نسل تک پہنچایا جاتا ہے۔ یہ پلیٹ فارمز شکوک و شبہات کو فروغ دینے کے لیے استعمال ہو رہے ہیں، جہاں عقائد کو جدید دور سے متصادم اور غیر ضروری ثابت کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔

Ex-Muslim تحریکات بھی سوشل میڈیا پر نمایاں ہیں، جو اسلام کو سخت اور جاہلانہ مذہب کے طور پر پیش کرتی ہیں۔ یہ تحریکات ذاتی کہانیوں اور تجربات کو جذباتی انداز میں پیش کر کے نوجوانوں کے دلوں میں دین کے بارے میں شکوک پیدا کرتی ہیں۔ روایتی میڈیا کے برعکس، سوشل میڈیا بغیر کسی سخت قواعد و ضوابط کے کام کرتا ہے، جس کی وجہ سے مثبت اور منفی دونوں قسم کا مواد بغیر کسی فلٹر کے پھیلتا ہے۔

سنہ 2018 میں ایم آئی ٹی کی ایک تحقیق کے مطابق، جو 2006 سے 2017

کے دوران ٹویٹر پر افواہوں کے پھیلاؤ کا جائزہ لے رہی تھی، تقریباً 1,26,000 افواہیں 3 ملین لوگوں کے ذریعے پھیلانی گئیں، اور یہ جھوٹے بیانیے 45 لاکھ بار سے زیادہ لوپت کیے گئے۔ (۱)

تحقیق کے مطابق ”جھوٹی خبریں سچائی کے مقابلے میں زیادہ لوگوں تک پہنچیں۔ جھوٹی خبروں کی سب سے زیادہ مقبول افواہیں 1000 سے 1,00,000 لوگوں تک پہنچیں، جبکہ سچائی شاذ و نادر ہی 1000 لوگوں سے زیادہ تک پہنچی۔ جھوٹ زیادہ تیزی سے بھی پھیلا۔ ان دونوں کے درمیان فرق کی ایک وجہ افواہوں کا بیان اور وصول کرنے والوں کے جذباتی رد عمل ہو سکتا ہے۔

... جھوٹ تمام اقسام کی معلومات میں سچائی کے مقابلے میں نمایاں طور پر زیادہ دور، تیزی، اور وسعت کے ساتھ پھیلا۔ اور سیاسی خبروں کے معاملے میں یہ اثرات اور زیادہ نمایاں تھے۔“ (۲)

آئی ٹی سیز کا کردار

سوشل میڈیا پر جھوٹی خبروں اور پروپیگنڈے کے فروغ میں آئی ٹی سیز کا کردار انتہائی اہم ہے۔ یہ منظم گروہ جعلی معلومات تخلیق اور ترسیل کرتے ہیں اور عوام کو گمراہ کرتے ہیں۔ یہ گروہ جھوٹے بیانیے کو تیزی سے پھیلانے کے لیے جعلی اکاؤنٹس، بوٹس، اور ٹرولنگ کا سہارا لیتے ہیں۔ مذہب، قومیت اور سیاست کے نام پر عوام کے

(1) Soroush Vosoughi, Deb Roy, and Sinan Aral, "The Spread of True and False News," Science, vol. 359, no. 6380 (March 2018): 1146)

(2) 51–Vosoughi, Roy, and Aral, 1146.

جذبات کا استحصال کرنا ان کا بنیادی ہتھیار ہے، جس کے ذریعے وہ اختلافات کو ہوا دیتے ہیں اور سچائی کو دباتے ہیں۔ ان کی سرگرمیاں معاشرے میں غلط فہمیوں اور تقسیم کا سبب بنتی ہیں۔

روایتی میڈیا بھی اس مسئلے میں اپنا حصہ ڈال رہا ہے، جہاں مذہب کو اکثر دقیقانوسی اور قدامت پسند کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ فلموں، ٹی وی شوز، اور دیگر مواد کے ذریعے خدا کے وجود کو غیر منطقی اور مذہبی اقدار کو غیر ضروری باور کرانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ یہ سب مل کر ایک ایسا ماحول پیدا کرتے ہیں، جو الحاد کے فروغ اور دین سے دوری کا سبب بن رہا ہے۔

8. دینی تعلیمات کی کمی

نوجوان نسل کو دین کے بارے میں صحیح معلومات فراہم نہ کرنے کی وجہ سے وہ مذہب کو غیر منطقی اور غیر متعلقہ سمجھنے لگتے ہیں۔ دین کے بنیادی عقائد اور حکمتوں کو نہ سمجھنے کی وجہ سے وہ الحاد کی طرف مائل ہو جاتے ہیں۔

9. اخلاقی زوال اور خواہشات کی اہمیت

جب معاشرے میں اخلاقی اقدار کا زوال آتا ہے اور خواہشات کو سب سے زیادہ اہمیت دی جاتی ہے، تو دین کے اصول اور خدا کے احکامات انسان کو رکاوٹ محسوس ہونے لگتے ہیں۔

10. سوالات کا تسلی بخش جواب نہ ملنا

نوجوان نسل کے مذہب سے متعلق سوالات اور شکوک کو بنجیدگی سے نہ لینا بھی الحاد

کی ایک بڑی وجہ ہے۔ جب انہیں ان کے سوالات کے تسلی بخش اور منطقی جواب نہیں ملتے، تو وہ دین کو ترک کر دیتے ہیں۔

نتیجہ: الحاد کے بڑھنے کے یہ تمام اسباب انسان کے نفس، معاشرتی اثرات، اور علمی کمی کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ اس مسئلے کے حل کے لیے ضروری ہے کہ دین کو صحیح انداز میں پیش کیا جائے، نوجوانوں کے سوالات کا بخیدہ اور علمی جواب دیا جائے، اور انہیں یہ باور کرایا جائے کہ دین ان کی فطرت، عقل، اور دل کی تسکین کے عین مطابق ہے۔ دین کی اصل روح کو سمجھنے اور سمجھانے سے ہی الحاد کے اس رجحان کو روکا جاسکتا ہے۔

الحاد کے منفی اثرات: اخلاقی زوال

ملاحدین اکثر یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ اچھے اخلاقی اصولوں کی پیروی کرتے ہیں اور معاشرے کی بھلائی کے لیے کام کرتے ہیں۔ بلاشبہ، بعض ملاحد اخلاقی طور پر اچھے ثابت ہو سکتے ہیں، لیکن سوال یہ ہے کہ اگر خدا کے وجود کو تسلیم نہ کیا جائے تو ہم ایسی دنیا میں رہتے ہیں جو اخلاقیات کے کسی مضبوط بنیاد سے محروم ہے۔ صرف یہ کہنا کہ ہم اچھے ہیں، اخلاقیات کے لیے کوئی معقول دلیل فراہم نہیں کرتا۔ مزید یہ کہ جہاں ہم اچھے ہوتے ہیں، وہاں کئی مواقع پر ہم برے بھی ہوتے ہیں اور دوسروں کے مفادات کے خلاف کام کرتے ہیں، کیونکہ کہیں نہ کہیں ہمارا ذاتی مفاد اس میں شامل ہوتا ہے۔ جب ذاتی مفاد ہی معیار ہو تو بد اخلاقی بھی اسی سے جنم لیتی ہے۔

مسئلہ صرف اچھا ہونا نہیں بلکہ اس بات کو سمجھنا ضروری ہے کہ ہمیں اچھا کیوں ہونا

چاہیے۔ اسی لیے معروف ملحد فلسفی مائیکل روس نے کہا کہ ”اخلاقیات ایک دھوکہ ہے۔“
شان کیروول نے بھی اسی نکتے پر زور دیتے ہوئے کہا: ”جو ہونا چاہیے“ کو ”جو ہے“ سے
اخذ کرنا ایسا ہی ہے جیسے جفت اعداد کو جوڑ کر طاق عدد حاصل کرنے کی کوشش کرنا۔
اگر کوئی یہ دعویٰ کرے کہ اس نے ایسا کیا ہے، تو آپ کو یقین ہوگا کہ اس نے غلطی کی
ہے۔“ (۱)

الحاد اخلاقیات کی کوئی مضبوط بنیاد فراہم نہیں کرتا۔ اگر کائنات کو محض مادی
اصول اور قوانین پر مبنی مانا جائے تو یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ صحیح اور غلط کی پہچان کیسے کی
جائے؟ کسی چیز کا وجود (is) یہ فیصلہ نہیں کر سکتا کہ وہ کیا ہونا چاہیے (ought)۔

اسلامی نقطہ نظر

اسلامی تعلیمات ہمیں اخلاقیات کی بنیاد قرآن و سنت میں فراہم کرتی ہیں اور یہ
واضح کرتی ہیں کہ ہمیں کیا کرنا چاہیے اور کیوں کرنا چاہیے۔ اس کے برعکس، الحاد
اخلاقیات کو ذاتی یا سماجی مفادات سے جوڑتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان سماج
کے فائدے کے لیے اس لیے کام کرے کہ اسے خود بھی اس سے فائدہ ہو۔ لیکن یہ
اصول انسان کو خود غرضی کی طرف لے جاسکتا ہے۔ اگر کسی وقت ذاتی مفاد سماجی بھلائی
کے خلاف ہو تو کون انسان کو مجبور کرے گا کہ وہ دوسروں کے بارے میں سوچے؟

مثال کے طور پر، اگر کسی کو جھوٹ بول کر فوری فائدہ ہو رہا ہو تو اسے سچ بولنے پر
کون آمادہ کرے گا؟ اس صورت میں اچھے اور برے کی تمیز کس اصول پر ہوگی؟ صرف
یہ کہنا کہ ایک عمل سماج کے لیے فائدہ مند ہے، یہ وضاحت نہیں کرتا کہ اسے اپنانا اخلاقی
طور پر کیوں ضروری ہے۔

فرض کریں، ایک صنعتکار کے پاس دو راستے ہیں: یا تو وہ اپنے فیکٹری کے فضلے کو مناسب طریقے سے تلف کرے، جس پر وقت اور پیسہ خرچ ہوگا، یا اسے قریبی دریا میں چھوڑ دے اور اخراجات بچائے۔ اگر دریا میں فضلہ چھوڑنے سے اس کا فائدہ زیادہ ہو اور اس کا روبرو بڑھ سکے، تو پھر وہ سماج کے لیے اچھا کیوں کرے گا؟ اگر ذاتی مفاد ہی معیار ہو تو اصول توڑنے سے کون روکے گا؟

یہی وہ خلا ہے جسے اسلامی تعلیمات پورا کرتی ہیں۔ اسلام نہ صرف اخلاقی اصول فراہم کرتا ہے بلکہ ان کے پیچھے مضبوط الہامی وجوہات اور ترغیب بھی دیتا ہے، جو انسان کو ذاتی مفاد سے بالاتر ہو کر معاشرتی بھلائی اور اخلاقی اقدار کی طرف مائل کرتی ہیں۔

صحیح اور غلط کا نسبتی تصور

محدثین کے فلسفہ حیات کے مطابق صحیح اور غلط کا فرق محض نسبتی بن کر رہ جاتا ہے، جہاں ہر فرد اپنی مرضی کے مطابق فیصلہ کر لیتا ہے۔

ریچرڈ ڈاؤکنز اپنی کتاب **The Selfish Gene** میں لکھتا ہے:

”آئیے سخاوت اور ایثار کو فروغ دینے کی کوشش کریں، کیونکہ ہم فطری طور پر خود غرض پیدا ہوتے ہیں۔ آئیے یہ سمجھیں کہ ہمارے جینز کیا کر رہے ہیں تاکہ شاید ہم ان کے منصوبوں کو ناکام بنا سکیں۔“

اس سے یہ سوال پیدا ہوتا ہے: اگر ہم فطری طور پر اپنے جینز کے تابع ہیں، جیسا کہ ڈاؤکنز کا دعویٰ ہے، تو پھر ان خود غرض جینز کے خلاف جانے کی کوئی معقول وجہ کیا ہو سکتی ہے؟ آپ ہی کے نظریے کے مطابق، اگر ہمارے اعمال محض جینیاتی پروگرامنگ کا نتیجہ ہیں، تو پھر جینز کے خلاف عمل کیوں کیا جائے؟

اگر انسان صرف اپنے جینز کے تابع ہوتا تو ایثار، قربانی، اور اخلاقی رویوں کی کوئی وضاحت نہ ہوتی۔ ان اعمال کی موجودگی اس بات کی دلیل ہے کہ انسان مادی حقائق سے بڑھ کر کچھ اور ہے۔ انسان اپنے جینیاتی پروگرام کے خلاف عمل کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے، کیونکہ اس کی ذات کسی بلند اور مادی اصول سے جڑی ہوئی ہے جو اسے اخلاقی وجود بناتی ہے۔

خدا کے بغیر اخلاقیات کا دعویٰ محض ایک نظریاتی مفروضہ بن کر رہ جاتا ہے۔ انسانی فطرت میں ہمدردی، رحم دلی، اور دوسروں کے دکھ درد کو محسوس کرنے کا جذبہ پایا جاتا ہے۔ لیکن ایک ملحد کے نزدیک یہ جذبات محض کیمیائی رد عمل ہیں جو انسان کے جسم میں وقوع پذیر ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر، ہم بیماروں کی مدد کرتے ہیں، بھوکوں کو کھانا کھلاتے ہیں، یا غریبوں کو لباس فراہم کرتے ہیں، اور ان کے مطابق یہ سب کچھ ایک مخصوص کیمیائی عمل کا نتیجہ ہے جو ہمیں ایسا کرنے پر اکساتا ہے۔

سوال یہ ہے کہ اگر بھلائی اور برائی کا تصور محض کیمیائی عمل کا نتیجہ ہے، تو کیا حمد، لالچ، عداوت، اور انتقام بھی اسی کا حصہ نہیں؟ تو پھر ان کو برا کیوں کہا جائے؟ اگر یہ منطق تسلیم کر لی جائے تو ہر عمل چاہے وہ ظاہری طور پر کتنا ہی برا ہو، اسے کیمیائی عمل کا نتیجہ کہہ کر جواز فراہم کیا جاسکتا ہے۔ یہ تصور اخلاقیات کو بے معنی اور غیر مستحکم بنا دیتا ہے، کیونکہ کوئی بھی عمل اچھا یا برا کہنے کے قابل نہیں رہتا۔

ایک ملحد یہ دعویٰ کر سکتا ہے کہ وہ اپنے ضمیر کی رہنمائی میں زندگی گزارتا ہے، لیکن حقیقت میں یہ ضمیر اس کے جینیاتی کوڈ کی آواز ہے، جیسا کہ وہ بالواسطہ طور پر خود تسلیم کرتا ہے۔ یہ ایک بہانہ ہے جو ہر خواہش اور ہر رجحان کو جائز قرار دینے کے لیے استعمال ہوتا ہے۔

جب خدا اور اس کے احکام کو نظر انداز کر دیا جائے تو انسان کو ہر قسم کے قبیح عمل کی آزادی حاصل ہو جاتی ہے۔ یہ ایک خود ساختہ نظام ہے جہاں انسان خود ہی جج، خود ہی منصف، اور خود ہی اپنا وکیل بن جاتا ہے تاکہ ہر بار خود کو بے قصور قرار دے سکے۔ یہ الحادی اخلاقیات کا وہ نظام ہے جسے نیٹشے نے ”نیک و بدی سے ماورا“ کہا تھا۔ اس نظام میں انسان اپنی مرضی کے مطابق اخلاقی معیارات طے کرتا ہے، جو بنیادی طور پر اخلاقی زوال اور انتشار کا سبب بنتا ہے۔

بے مقصدیت اور اخلاقیات کا تعلق

یہ عجیب تضاد ہے کہ ایک طرف الحاد کے مطابق انسان محض ایک حادثے کا نتیجہ ہے، جس کے وجود اور اعمال کا کوئی خاص مقصد نہیں، اور دوسری طرف اخلاقیات اور غیر اخلاقیات کی بات کی جاتی ہے۔ اگر الحاد کے مطابق انسان محض مالمیکیولز کے ایک بے ترتیب امتزاج کا نتیجہ ہے، تو اخلاقیات کا تصور ہی بے معنی ہو جاتا ہے۔ یہی بات پیٹر میچنز نے اپنی کتاب **The Milican Brief** میں یوں بیان کی:

”ہم ایک بے معنی حادثہ ہیں جو ایک اور بے معنی حادثے کے درمیان زندگی بسر کر رہے ہیں۔ ہماری زندگی اور اعمال کی کوئی اہمیت نہیں سوائے ان کے فوری اثرات کے۔“

جب انسان کو بے مقصد سمجھا جائے تو اخلاقیات کی بحث غیر ضروری اور بے معنی ہو جاتی ہے، کیونکہ اخلاقیات کا تصور مقصدیت پر مبنی ہوتا ہے۔

ایڈلس بکسلے کا اعتراف:

الحاد کے اس تضاد کو بعض ملحد فلسفیوں نے خود تسلیم کیا ہے۔ ایڈلس بکسلے اپنی

کتاب (1937) **Ends and Means** میں اعتراف کرتے ہیں کہ انہوں نے دنیا کو بے معنی سمجھنے کا فلسفہ اختیار کیا تا کہ وہ اپنی خواہشات کے مطابق زندگی گزار سکیں۔ ان کے مطابق، بے معنویت کا فلسفہ دراصل ایک ”آزادی“ کا ذریعہ تھا تا کہ وہ کسی اخلاقی قید سے آزاد ہو سکیں اور اپنے ذاتی سیاسی مفادات حاصل کر سکیں۔ یہ تسلیم کرنا کہ الحاد کا مقصد صرف اخلاقی اور سماجی آزادی حاصل کرنا ہے، الحادی فکر کی اصل حقیقت کو بے نقاب کرتا ہے۔ ایک ملحد خود کو ”آزاد“ اور ”بے خوف“ ظاہر کرتا ہے، گویا وہ زندگی کی بے معنویت کو قبول کر کے ایک بہادرانہ قدم اٹھا رہا ہے۔ لیکن حقیقت میں الحاد کو قبول کرنے کی وجہ زیادہ تر یہ ہوتی ہے کہ اس میں انسان کو اپنی مرضی کے مطابق زندگی گزارنے کا جواز ملتا ہے، بغیر کسی مادی یا اخلاقی اصول کی پابندی کے۔ آخر ایسے معاشرے کا کیا حال ہوگا جہاں ہر شخص اپنے مفاد کے مطابق اخلاقیات کے اصول بنالے؟ یہی صورت حال ان الفاظ سے واضح ہوتی ہے:

Where everyone is subjectively moral is also a morality where everyone is subjectively immoral.

Logically this mean no morality at all

جہاں ہر شخص کی اخلاقیات ذاتی ہوتی ہیں، وہیں ہر شخص کی غیر اخلاقیات بھی ذاتی ہوتی ہیں۔ منطقی طور پر، اس کا مطلب یہ ہے کہ ایسی صورت میں کوئی اخلاقیات موجود نہیں ہوتیں۔

جب اخلاقیات مکمل طور پر ذاتی ہو جائے، تو ہر فرد اپنی اخلاقیات خود طے کرے گا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ایک شخص کا اخلاقی عمل دوسرے کے لیے غیر اخلاقی ہو سکتا ہے، اور معاشرے میں صحیح اور غلط کی وضاحت کا کوئی مشترکہ معیار نہیں رہے گا۔ ایسی

صورت میں اخلاقیات کی حیثیت ختم ہو جاتی ہے، اور سماج انتشار اور خود غرضی کی گرفت میں آ جاتا ہے۔

یہ بات دلچسپی سے خالی نہیں کہ خود الحادی فلسفے کے بڑے مفکرین بھی اس حقیقت کو تسلیم کرتے ہیں کہ حقیقی انسانوں کے لیے معروضی اخلاقیات تخلیق کرنا ناممکن ہے۔ فلسفی شیفر لینڈ اس حوالے سے لکھتے ہیں:

”اخلاقی سچائی اس وقت ممکن ہے جب کسی شخص کا نقطہ نظر مکمل طور پر غیر جانبدار، جذبات سے آزاد، اور خالص عملی عقل کے اصولوں پر مبنی ہو۔“

تاہم، وہ یہ بھی مانتے ہیں کہ یہ مثالی معیار انسانوں کے لیے ناقابل حصول ہے: ”یہ غیر جانبدار نقطہ نظریا تو حقیقی انسانوں کے لیے مکمل طور پر ناقابل رسائی ہے، یا پھر ایسی حالت میں قابل حصول ہے جب انسان اپنے موجودہ جذبات اور نظریات سے مکمل طور پر لاتعلق ہو جائے۔“

دوسرے الفاظ میں، اگر کوئی شخص معروضی اخلاقیات تخلیق کرنا چاہے تو اسے ایک ایسی حالت تک پہنچنا ہوگا جو کسی خدائی حیثیت کے قریب ہو، یعنی تمام تعصبات، ذاتی مفادات اور جذبات سے آزاد۔ لیکن یہ ایک انسانی حد سے باہر کی بات ہے، کیونکہ انسان اپنی فطرت کے لحاظ سے جذبات، نظریات، اور ذاتی ترجیحات کے زیر اثر رہتا ہے۔

لینڈ او مزید لکھتے ہیں:

”یہ بات واضح ہے کہ ایسے نظریات پر ہونے والی تنقید اکثر ان کے اس دعوے پر ہوتی ہے کہ وہ غیر جانبدار نقطہ نظر کو کامیابی سے حاصل کر چکے ہیں۔“

لہذا، اگر کوئی شخص اپنے عقائد، خواہ وہ اسلام مخالف ہوں یا کسی اور نظریے کی تعظیم

کرتے ہوں، کے ساتھ معروضی اخلاقیات تخلیق کرنے کا دعویٰ کرے، تو یہ ممکن نہیں۔ یہ تعصبات اور نظریاتی جھکاؤ معروضی اخلاقیات کے قیام میں رکاوٹ بنتے ہیں۔ اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ الحاد معروضی اخلاقیات کی کوئی بنیاد فراہم نہیں کرتا۔ بغیر کسی ماورائی ہدایت یا الہامی اصول کے، اخلاقیات انسانی خواہشات اور نظریات کے تابع ہو جاتی ہیں، جو ہمیشہ بدلتے رہتے ہیں اور معاشرتی اصولوں کو غیر مستحکم بنا دیتے ہیں۔ یہی الحادی فکر کی سب سے بڑی کمی ہے۔ ذیل میں الحادی اخلاقیات کے چند عام دعوے اور ان کی تردید پیش کی گئی ہے:

دعویٰ 1:

”اخلاقیات کی بنیاد انسانی عقل پر ہے۔“

تردید 1:

عقل کی محدودیت: انسانی عقل محدود اور خطا پذیر ہے۔ مختلف افراد اور معاشروں کی عقل مختلف نتائج اخذ کرتی ہے، جس کی وجہ سے اخلاقی اصولوں میں تضاد پیدا ہوتا ہے۔ اگر اخلاقیات کی بنیاد صرف انسانی عقل پر ہو تو کوئی بھی معروضی اور عالمگیر اخلاقی معیار قائم نہیں کیا جاسکتا۔

2. عقل اور جذبات کا تعلق: انسانی فیصلے اکثر جذبات سے متاثر ہوتے ہیں، اور صرف عقل پر انحصار کرنا عملی طور پر ممکن نہیں۔ جذباتی تعصبات عقل کے فیصلوں کو متاثر کر سکتے ہیں، جس سے اخلاقی اصول غیر مستحکم ہو جاتے ہیں۔

دعویٰ 2:

اخلاقیات کا ماخذ سماجی معاہدہ ہے۔

تردید:

1. سماجی معاہدے کی غیر مستقل مزاجی: مختلف معاشروں میں سماجی معاہدے مختلف ہوتے ہیں، اور یہ وقت کے ساتھ تبدیل بھی ہو سکتے ہیں۔ اگر اخلاقیات کا دارومدار سماجی معاہدے پر ہو تو کوئی بھی عمل ایک معاشرے میں اخلاقی اور دوسرے میں غیر اخلاقی قرار پاسکتا ہے، جو اخلاقیات کی معروضیت کو ختم کر دیتا ہے۔

2. اقلیتی حقوق کا مسئلہ: اگر اکثریت کسی عمل کو درست سمجھتی ہے تو سماجی معاہدے کے تحت وہ اخلاقی قرار پائے گا، چاہے وہ اقلیتوں کے حقوق کے خلاف ہی کیوں نہ ہو۔ اس صورت میں اقلیتوں کے حقوق کی حفاظت کیسے ممکن ہوگی؟

قتل، ریپ، اور دیگر قبیح اعمال کا جواز؟

اگر کسی وقت یا کسی معاشرے میں اکثریت نے قتل، ریپ، یا دیگر قبیح اعمال کو جائز قرار دے دیا، تو کیا ان اعمال کو اخلاقی سمجھا جائے گا؟

تاریخ میں ایسی کئی مثالیں موجود ہیں جہاں اکثریتی فیصلوں کے تحت غیر انسانی اعمال جائز سمجھے گئے۔ غلامی، ہولوکاسٹ، اور دیگر نسل کشی کی مثالیں ایسے معاشرتی فیصلوں کا نتیجہ ہیں جہاں اکثریت نے ان اعمال کو قبول کیا۔

اگر اخلاقیات کا تعین صرف اکثریت کے ذریعے ہو تو ان اعمال کی مذمت ممکن نہیں رہتی۔ مطلق اخلاقیات کا تصور ہی ہمیں یہ اختیار دیتا ہے کہ ہم ان اعمال کو ہر زمانے اور معاشرے میں غلط قرار دے سکیں۔

اگر الحادی اخلاقیات کے مطابق رائج دستور یا معاشرتی اصول ہی اخلاقیات کا معیار ہیں، تو پھر نبی اکرم ﷺ کی ان مبارک عادات یا معاشرتی روایات پر اعتراض

کرنے کا حق ملحدین کو کیسے حاصل ہے جو اُس وقت کے سماج میں عام اور قابل قبول تھیں؟ اگر وہ اس بات کے قائل ہیں کہ ہر دور کے اپنے رائج اصولوں کو تسلیم کیا جائے، تو نبی ﷺ کے دور کے ان طریقوں پر اعتراض کرنا ان کے اپنے نظریے کے خلاف ہے۔ یہ دو ہر معیار اور فکری تضاد واضح کرتا ہے کہ الحادی اخلاقیات معروضی نہیں بلکہ اپنی پسند اور تعصب پر مبنی ہیں۔ نبی ﷺ کی ذات اور تعلیمات پر تنقید کرنے کے لیے ایک مطلق اخلاقی معیار ہونا ضروری ہے، جو الحاد فراہم نہیں کر سکتا، اس لیے ان کے اعتراضات غیر معقول اور غیر منصفانہ ہیں۔

نبی ﷺ اور رائج معاشرتی اصولوں پر تنقید:

نبی اکرم ﷺ نے اپنے زمانے میں کئی رائج رسم و رواج اور معاشرتی اصولوں پر تنقید کی۔ جاہلی عرب میں لڑکیوں کو زندہ دفن کرنا ایک رائج عمل تھا۔ اگر رائج طریقے ہی اخلاقیات کا معیار ہوتے تو اس پر اعتراض کا کوئی جواز نہیں بنتا تھا۔ نبی ﷺ نے واضح کیا کہ رائج اصول ہمیشہ حق اور سچائی کے مطابق نہیں ہوتے۔ حق کی بنیاد الہامی ہدایت اور مطلق اخلاقیات پر ہے، نہ کہ اکثریتی فیصلوں پر۔

دعویٰ 3:

اخلاقیات کا تعین سائنسی طریقہ کار سے کیا جاسکتا ہے۔

تردید:

سائنس کی حدود: سائنس حقائق کا مطالعہ کرتی ہے، جبکہ اخلاقیات کا تعلق اقدار سے ہے۔ سائنسی طریقہ کار سے یہ تعین کرنا ممکن نہیں کہ کیا کرنا چاہیے اور کیا نہیں۔

ایک اہم وضاحت:

الحاد کے تناظر میں اخلاقیات پر گفتگو کرتے ہوئے یہ ضروری ہے کہ اخلاقی معرفت (Moral Epistemology) اور اخلاقی وجودیات (Moral Ontology) کے درمیان فرق کو واضح کیا جائے تاکہ کسی قسم کی الجھن یا اعتراض پیدا نہ ہو۔

اخلاقی معرفت (Moral Epistemology) اس بات سے متعلق ہے کہ انسان اچھے اور برے کی تمیز کیسے کرتا ہے۔ یہ اس طریقہ کار کا جائزہ لیتا ہے جس کے ذریعے ہم اخلاقی اصولوں کو سمجھتے اور پہچانتے ہیں۔ اس بات سے انکار نہیں کہ ایک ملحد بھی یہ سمجھ سکتا ہے کہ جھوٹ بولنا یا چوری کرنا غلط ہے۔

لیکن ہماری بحث کا مرکز اخلاقی وجودیات (Moral Ontology) ہے، جو اس بات سے متعلق ہے کہ اخلاقی اصولوں کی اصل بنیاد کیا ہے۔ اخلاقی وجودیات یہ سوال اٹھاتی ہے کہ اچھائی اور برائی کے معروضی (objective) اصول کہاں سے آتے ہیں؟ اگر کائنات ایک بے مقصد اور اتفاقی عمل کا نتیجہ ہے تو پھر ان معروضی اخلاقی اصولوں کا ماخذ کیا ہوگا؟

یہاں ایک اہم نکتہ یہ ہے کہ الحاد معروضی اخلاقیات کے لیے کوئی بنیاد فراہم نہیں کر سکتا۔ اگر خدا کا وجود نہ مانا جائے تو اچھائی اور برائی محض انسانی ترجیحات اور سماجی معاہدوں تک محدود ہو جاتی ہیں، جو بدلتی ہوئی اقدار کے ساتھ تبدیل ہو سکتی ہیں۔ معروضی اخلاقیات، یعنی وہ اصول جو ہر زمانے اور ہر جگہ پر لاگو ہوں، صرف اس وقت ممکن ہیں جب ایک اعلیٰ اور معروضی ہستی (یعنی خدا) ان کا ماخذ ہو۔

لہذا، ہماری گفتگو کا محور یہ نہیں کہ ایک ملحد اخلاقیات کو سمجھ سکتا ہے یا نہیں (moral epistemology)، بلکہ یہ ہے کہ الحاد اخلاقیات کی معروضی بنیاد (moral ontology) فراہم کرنے میں ناکام ہے۔

امید کا خاتمہ

انسانی زندگی میں امید کی اہمیت سے کون انکار کر سکتا ہے؟ امید ہی وہ قوت ہے جو انسان کو مشکلات کے مقابلے میں ڈٹے رہنے، صبر کرنے، اور بہتر مستقبل کی خواہش رکھنے پر مجبور کرتی ہے۔ ہر انسان اپنی زندگی میں ایسے اوقات کا سامنا کرتا ہے جب اس کے پاس صرف اپنے خالق حقیقی سے دعا کے ذریعے سہارا لینے کے علاوہ کوئی راستہ نہیں ہوتا۔ لیکن ملحدین کے نزدیک انسان محض ایک حادثہ ہے جس کی کوئی اعلیٰ غایت یا مقصد نہیں۔ ان کے نزدیک نہ زندگی کا کوئی حقیقی نصب العین ہے اور نہ ہی کوئی خالق۔ ایسی صورت میں انسان امید کہاں سے پیدا کرے؟ اگر زندگی کو محض حادثہ سمجھا جائے اور کسی مافوق الفطرت ہستی کو تسلیم نہ کیا جائے تو حالات اور مصیبتوں سے مایوس ہونا ایک فطری نتیجہ بن جاتا ہے۔ وہ انسان جو ایسے ماحول میں زندگی بسر کر رہا ہو جہاں بھوک، غریبی، ظلم، اور مشکلات نے اسے گھیر رکھا ہو، اس کے لیے خدا پر ایمان نہایت اہم ہے۔ ایمان اسے یہ امید دیتا ہے کہ آخرت میں اس کی ان مشکلات کا بہترین بدلہ ملے گا۔ لیکن ایک ملحد کے لیے ایسی زندگی محض اذیت، دکھ اور مایوسی کے سوا کچھ نہیں، کیونکہ اس کے نزدیک زندگی کے بعد کوئی وجود نہیں، اور ہر چیز فنا ہو جانے والی ہے۔

اگر کوئی خدا نہیں تو دنیا میں ہونے والے ظلم کا کوئی حتمی حل نہیں:

ظالم کو سزا نہیں: اگر خدا نہیں تو ظالم انسان اپنی زندگی میں کسی بڑے انجام کے بغیر مر سکتا ہے۔ نہ کوئی آخرت ہے، نہ کوئی انصاف۔ ایسے معاشرے میں ظلم کا بڑھنا لازمی ہے۔

مظلوم کی ناامیدی: مظلوم کے لئے خدا پر یقین ایک طاقت ہے، کہ اس کی فریاد سنی جائے گی اور ظالم کو سزا ملے گی۔ لیکن خدا کے بغیر یہ امید بھی مٹ جاتی ہے، اور معاشرے میں مایوسی اور انتقام کی سوچ پروان چڑھتی ہے۔

خدا پر یقین انسان کو بھلائیوں کی طرف راغب کرتا ہے، کیونکہ وہ اپنے اعمال کے نتائج سے آگاہ ہوتا ہے اور اسے حساب و کتاب کا خوف رہتا ہے۔ اس کے برعکس، ملحدین کے پاس ایسا کوئی تصور یا خوف نہیں ہوتا جو انہیں اچھائی کے اصولوں پر عمل کرنے کی بنیاد فراہم کرے۔ ان کے لیے زندگی صرف ایک حادثاتی مظہر ہے، جس میں کوئی معنی یا مقصد نہیں۔

مایوسی اور امید کے درمیان یہ فرق فلسفی آرتھر شوپنہاور کے ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے:

”ہم میدان میں موجود ان بھڑوں کی مانند ہیں جو ایک قصاب کی آنکھ کے سامنے کھیل رہی ہیں، جو وقتاً فوقتاً کسی کو شکار کے لیے منتخب کر لیتا ہے۔ ہماری اچھی حالت میں ہم اس بات سے غافل ہوتے ہیں کہ قسمت ہمارے لیے کیا مصائب تیار کیے ہوئے ہے، جیسے بیماری، غربت، معذوری، یا عقل و شعور کا کھونا۔ زندگی کے عذابوں میں ایک بڑا حصہ یہ ہے کہ وقت ہمیشہ ہمارے اوپر دباؤ ڈال رہا ہے، کبھی ہمیں سانس لینے کی مہلت نہیں دیتا۔ اور اگر وقت کبھی تھم جاتا ہے، تو صرف اس وقت جب ہم بوریت کے عذاب میں مبتلا ہوتے ہیں۔ درحقیقت، یہ یقین کہ دنیا اور انسان کچھ ایسا ہے

جس کا وجود نہ ہوتا تو بہتر ہوتا، ہمیں ایک دوسرے کے ساتھ ہمدردی کا درس دیتا ہے۔ اس نقطہ نظر سے، ہم ایک دوسرے کو مخاطب کرنے کے لیے 'مسٹر'، 'سر'، یا 'جناب کی بجائے' میرے ساتھی مظلوم یا 'مصائب کے ہمسفر کہہ سکتے ہیں۔ (۱)

قرآن مجید ہمیں امید کا درس دیتا ہے اور اس حقیقت کی طرف رہنمائی کرتا ہے کہ خدا کی رحمت ہمیشہ ساتھ ہے، بشرطیکہ ہم اس سے رجوع کریں اور اس کی طرف لوٹ آئیں۔ اس کے برعکس، ملحدین کے نقطہ نظر میں کوئی ایسی بنیاد نہیں جو انہیں زندگی میں ایک مستقل امید فراہم کر سکے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے ہاں نہ زندگی کے کسی اعلیٰ مقصد کا تصور ہے، نہ کسی خالق کا یقین جو ان کے مصائب کو دور کر سکے۔ قرآن ہمیں مشکلات کے باوجود خدا کی رحمت پر یقین رکھنے کا درس دیتا ہے۔ سورہ یوسف میں فرمایا گیا:

اور اللہ کی رحمت سے ناامید نہ ہو، یقیناً اللہ کی رحمت سے صرف کافر ہی ناامید ہوتے ہیں۔ (۲)

اسی طرح سورہ ق میں جنت کا ذکر کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

وہاں ان کے لیے ہر وہ چیز ہوگی جو وہ چاہیں گے، اور ہمارے پاس مزید بھی ہے۔ (۳)

سورہ یونس میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

”جو لوگ بھلائی کریں گے، ان کے لیے بھلائی ہے، اور اس پر مزید بھی ہوگا۔“

(1) Studies in Pessimism: On the Sufferings of the World.

(۲) سورہ یوسف: ۱۲:۸۷

(۳) سورہ ق: ۵۰:۳۵

ان کے چہرے نہ تو غبار آلود ہوں گے اور نہ ہی ان پر ذلت چھائے گی۔ یہی جنتی لوگ ہیں، وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔" (۱)

خدا پر ایمان نہ رکھنے والے افراد کے لیے ان آیات میں پیش کی گئی امید ممکن نہیں۔ ان کے پاس نہ آخرت کی خوشخبری ہے اور نہ ہی کسی ماورائی ہستی پر یقین جس سے وہ اپنی تکالیف کا مداوا حاصل کر سکیں۔ لیکن قرآن ہمیں بتاتا ہے کہ خدا کی رحمت نہ صرف دائمی ہے بلکہ اس کی وسعت انسان کے تصور سے بھی زیادہ ہے۔

یہ امید انسان کو نہ صرف اپنی زندگی میں مثبت سوچنے کی صلاحیت دیتی ہے بلکہ اسے صبر، شکر، اور بھلائیوں کی طرف بھی راغب کرتی ہے۔ اس کے برعکس، خدا کے وجود کا انکار انسان کو مایوسی اور بے یقینی کی طرف لے جاتا ہے۔

جب دہریت کا نظریہ زندگی پر غالب آتا ہے تو وہ ہر چیز کو بے معنویت کے گہرے اندھیرے میں دھکیل دیتا ہے۔ ایک ایسے شخص کے لئے جو یہ مانتا ہو کہ زندگی کے بعد کوئی وجود نہیں، کوئی حساب و کتاب نہیں، تو اچھائی اور برائی کے بیچ فرق کرنے کا کیا جواز باقی رہتا ہے؟ کیا اچھائی کرنے والے کا انجام اور برائی کرنے والے کا انجام ایک جیسا ہونا انصاف کہلا سکتا ہے؟

سوچئے! وہ شخص جو اپنی پوری زندگی دوسروں کی خدمت میں گزار دیتا ہے، یتیموں کے آنسو پونچھتا ہے، بھوکوں کو کھانا کھلاتا ہے، اور ہر قدم پر انسانیت کی بھلائی کے لئے قربانیاں دیتا ہے، وہ اپنی موت کے بعد ہمیشہ کے لئے فنا ہو جاتا ہے۔ اور دوسری طرف، وہ شخص جو ظلم و ستم کرتا ہے، دوسروں کا حق چھینتا ہے، اور برائی کی راہوں پر چلتا ہے، اس کا انجام بھی وہی موت ہے، بغیر کسی سزا کے۔

دہریت کے مطابق اچھائی اور برائی دونوں کا انجام موت کی خاموشی ہے۔ نہ اچھائی کرنے والوں کے لئے کوئی انعام، نہ برے کام کرنے والوں کے لئے کوئی سزا۔ تو پھر زندگی میں اچھائی کرنے کی کیا قدر باقی رہ جاتی ہے؟ اگر آخر کار سب کچھ ختم ہو جانا ہے، تو اچھائی کی جدوجہد کیوں کی جائے؟

اس بات کا اندازہ آپ رچرڈ ڈاکنز کے الفاظ سے لگا سکتے ہیں، جہاں وہ کہتا ہے:

”اس کے برعکس، اگر کائنات صرف الیکٹرانز اور خود غرض جینز کا مجموعہ ہو، تو بے معنی سانحات، جیسے کسی بس کا حادثہ، وہی ہیں جن کی توقع ہمیں کرنی چاہیے، اور اسی طرح کی بے مقصد خوش نصیبی کے واقعات بھی۔ ایسی کائنات نہ نیک ہوگی نہ بد، نہ اس کی کوئی نیت ہوگی۔ یہ کسی بھی قسم کی نیت یا ارادے کی منظر نہیں ہوگی۔ اندھی طبیعتی قوتوں اور جینیاتی نقل و حرکت کی دنیا میں کچھ لوگ تکلیف اٹھائیں گے، کچھ خوش نصیب ہوں گے، اور آپ کو اس میں نہ کوئی منطق نظر آئے گی نہ کوئی مقصد، اور نہ ہی کوئی انصاف۔ وہ کائنات جسے ہم دیکھتے ہیں، بالکل وہی خصوصیات رکھتی ہے جس کی توقع ہونی چاہیے اگر اس کے پس منظر میں نہ کوئی ڈیزائن ہو، نہ کوئی مقصد، نہ اچھائی، نہ برائی، بلکہ صرف اندھی اور بے رحم بے نیازی ہو۔ (۱)

یہی وہ خالی پن ہے جو الحاد انسان کے دل میں چھوڑ دیتی ہے۔ یہ زندگی کے ان قیمتی جذبات، جیسے امید، انصاف، اور مقصد کو ایک عارضی اور بے بنیاد خیالی فلسفے کے تحت مٹا دیتی ہے۔ لیکن اگر ہم خدا پر ایمان رکھتے ہیں، تو یہ زندگی ایک آزمائش ہے، اور اس کے بعد ایک ابدی زندگی ہے جہاں ہر عمل کا حساب ہوگا۔ اچھائی کا انعام اور برائی کی سزا موجود ہوگی۔

الحاد ہمیں نہ کوئی امید دیتی ہے، نہ انصاف کا یقین۔ یہ ہمیں محض ایک بے مقصد زندگی کے اندھیرے میں چھوڑ دیتی ہے، جہاں سب کچھ آخر کار ختم ہو جانا ہے، اور کوئی بھی چیز حقیقی معنی نہیں رکھتی۔

محبت اور قربانی کی بے معنویت: ایک روحانی خلاء

الحاد کے فلسفے میں محبت، وفاداری، یا قربانی کو محض "دماغی کیمیکل ریشٹرز" یا حیاتیاتی عوامل کہا جاتا ہے۔ لیکن کیا واقعی ماں کی بے لوث محبت، باپ کی قربانیاں، یا کسی دوست کی بے غرض وفاداری کو صرف ایک حیاتیاتی ضرورت یا جینیاتی پروگرامنگ قرار دیا جاسکتا ہے؟ کیا ایک ماں کا اپنے بچے کی خاطر اپنی جان کی بازی لگا دینا، محض ایک ارتقائی عمل ہے؟ کیا قربانی، محبت، اور وفاداری کی گہرائی کو ہم محض سائنسی عوامل تک محدود کر سکتے ہیں؟

خدا کے وجود کے بغیر، یہ تمام عظیم جذبات اپنی روحانی حیثیت کھو دیتے ہیں۔ ماں کی محبت، جو انسانی تعلقات کی سب سے پاکیزہ شکل ہے، اگر خدا کے بغیر دیکھی جائے، تو وہ محض جینیاتی بقا کا ایک عمل رہ جاتی ہے۔ لیکن خدا پر ایمان رکھنے والے کے لئے یہ محبت ایک روحانی جذبہ ہے، جو خالق کی عطا کردہ نعمت ہے اور اس کے حساب کا حصہ ہے۔ یہ احساس کہ ہماری محبت اور قربانیاں خدا کی بارگاہ میں قبولیت کا درجہ رکھتی ہیں، انسان کے جذبات کو ایک عظیم مقصد عطا کرتا ہے۔

خدا پر یقین رکھنے والا شخص تعلقات کو ایک مقدس امانت سمجھتا ہے، کیونکہ وہ جانتا ہے کہ ان تعلقات کا حساب خدا کے سامنے دینا ہے۔ ایک ماں اپنے بچے سے محبت کرتی ہے، کیونکہ وہ جانتی ہے کہ یہ محبت خدا کے حکم کے تحت ہے۔ ایک دوست اپنی

وفاداری نبھاتا ہے، کیونکہ وہ جانتا ہے کہ خدا ان جذبات کو دیکھ رہا ہے۔ لیکن دہریت میں تعلقات محض وقتی ضرورت بن جاتے ہیں۔ محبت اور قربانی ذاتی مفاد یا وقتی فائدے کے تابع ہو جاتی ہیں۔

جب زندگی کا کوئی اعلیٰ مقصد نہ ہو، جب محبت، قربانی، اور وفاداری کو محض ایک کیمیکل ریکشن قرار دیا جائے، تو انسان کے جذبات اپنی گہرائی کھود دیتے ہیں۔ خدا پر ایمان ان جذبات کو نہ صرف ایک عظیم مقصد دیتا ہے بلکہ انہیں پاکیزگی اور ابدیت عطا کرتا ہے۔ محبت، قربانی، اور وفاداری خدا کے بغیر محض عارضی اور بے معنی ہیں، لیکن خدا کے ساتھ یہ جذبات نہ صرف انسانی تعلقات کو مضبوط کرتے ہیں بلکہ انہیں ابدی زندگی کی روشنی میں بامقصد بناتے ہیں۔

حقیقی خوشی کا اسلامی تصور:

الحاد کی دنیا میں ایک کھوئی ہوئی نعمت

دہریت کے ماننے والوں کے لئے خوشی ایک عارضی کیفیت ہے، جو دولت، شہرت، یا جسمانی لذتوں پر مبنی ہے۔ لیکن کیا یہ واقعی خوشی ہے؟ اگر یہ سچ ہوتا تو وہ لوگ جن کے پاس سب کچھ ہوتا ہے، سب سے زیادہ خوش ہوتے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ دنیا کے مشہور اور دولت مند افراد بھی اندر سے مایوسی اور خالی پن کا شکار ہوتے ہیں۔ کئی بار یہ لوگ ڈپریشن کا شکار ہو کر اپنی زندگی کا خاتمہ کر لیتے ہیں۔ کیوں؟ کیونکہ الحاد ان کے دل کو وہ سکون نہیں دے سکتا جو حقیقی خوشی کے لئے ضروری ہے۔

الحادی فکر میں خوشی کو مادہ پرستی، جسمانی لذتوں، اور دنیاوی کامیابیوں تک محدود

کیا جاتا ہے۔ لیکن یہ سب خوشی عارضی اور بے معنی ہے، کیونکہ انسان کو نہ اپنی زندگی کا مقصد معلوم ہوتا ہے، نہ موت کے بعد کی حقیقت کا۔ اگر زندگی صرف کھانے، پینے، اور وقتی لذتوں تک محدود ہو، تو پھر خوشی محض ایک دھوکہ بن کر رہ جاتی ہے۔

الحادی فکر میں یہ سوال کبھی حل نہیں ہوتا: ہم اس دنیا میں کیوں آئے ہیں؟ ہمارا مقصد کیا ہے؟ موت کے بعد کیا ہونا ہے؟ اگر یہ سوالات بے جواب ہوں، تو انسان کی خوشی محض وقتی خواہشات کا پیچھا کرنے تک محدود ہو جاتی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہم پیر پریشر (Peer Pressure) کا شکار ہو جاتے ہیں۔ ہم دوسروں کے پیچھے چلتے ہیں، ان جیسا بننے کی کوشش کرتے ہیں، صرف اس لئے کہ وہ ایسا کر رہے ہیں۔

مادیت کی غلامی

یاسمین مجاہد اپنی کتاب **Reclaim Your Heart** میں کہتی ہیں:

”ہر بار جب آپ کسی کمزور یا فانی چیز کے پیچھے بھاگتے ہیں، آپ بھی کمزور اور فانی ہو جاتے ہیں۔ حتیٰ کہ اگر آپ اسے پا بھی لیں جس کی آپ تلاش کر رہے ہیں، یہ کبھی کافی نہیں ہوگا۔ جلد ہی آپ کو کسی اور چیز کی تلاش ہوگی۔ آپ کبھی حقیقی سکون یا اطمینان حاصل نہیں کر سکیں گے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم ایک ایسی دنیا میں رہتے ہیں جہاں ہر چیز کو تبدیل اور اپ گریڈ کیا جاسکتا ہے۔ آپ کا فون، آپ کی گاڑی، آپ کا کمپیوٹر، آپ کا مرد یا عورت، سب کو نئے اور بہتر ماڈل کے لئے بدلا جاسکتا ہے۔ تاہم، اس غلامی سے آزادی ممکن ہے۔ جب آپ کا سہارا وہ شے بنے جو غیر متزلزل، غیر قابل شکست، اور دائمی ہو، تب ہی آپ گرنے سے بچ سکتے ہیں۔ (۱)

اسلام کا تصور خوشی اس دنیا سے بڑھ کر ہے۔ قرآن میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:
 ”اور جو لوگ ایمان لائے اور اچھے عمل کیے، وہ ان جنتوں میں داخل ہوں
 گے جہاں ان کے لئے جو کچھ وہ چاہیں گے موجود ہوگا، اور ہمارے پاس اور زیادہ
 بھی ہے۔“ (۱)

مزید فرمایا:

بے شک جو لوگ بھلائی کرتے ہیں، ان کے لئے بھلائی ہے اور اس سے بھی
 زیادہ۔ ان کے چہرے پر نہ سیاہی ہوگی اور نہ ذلت۔ یہی جنت والے ہیں، وہ اس میں
 ہمیشہ رہیں گے۔ (۲)

اسلام ہمیں یہ سکھاتا ہے کہ حقیقی خوشی اس وقت ملتی ہے جب ہم اپنی زندگی کا مقصد
 سمجھیں اور اس کے مطابق اللہ کی رضا کے لئے عمل کریں۔
 الحاد کی دنیا میں خوشی وقتی اور کھوکھلی ہوتی ہے۔ لیکن اسلامی تعلیمات انسان کو ایک
 اعلیٰ مقصد اور دائمی خوشی فراہم کرتی ہیں۔ مادیت کی غلامی انسان کو کبھی مطمئن نہیں کرتی،
 لیکن اسلام کا پیغام انسان کو اس دنیا میں بھی خوشی اور سکون دیتا ہے اور آخرت میں بھی
 دائمی انعامات کا وعدہ کرتا ہے۔ یہ وہ فرق ہے جو اسلام کی روشنی کو الحاد کے اندھیروں
 سے الگ کرتا ہے۔

الحاد کیوں غلط ہے؟

الحاد اور نیچرلزم (Naturalism) کے مطابق، انسانی دماغ محض بے ترتیب
 کیمیائی عوامل اور طبیعیاتی عمل کا نتیجہ ہے۔ اس نظریے میں عقل کو کسی بلند مقصد یا

(۱) سورۃ ق: ۳۵۔

(۲) سورۃ یونس: ۲۶

شعوری قوت کے بغیر ایک حادثاتی پیداوار سمجھا جاتا ہے۔ لیکن یہاں ایک بنیادی سوال پیدا ہوتا ہے: اگر انسانی عقل بے شعور، بے ترتیب اور بے مقصد عوامل کی پیداوار ہے، تو اس پر کس بنیاد پر بھروسہ کیا جاسکتا ہے؟

نیچرلزم دعویٰ کرتا ہے کہ تمام چیزیں طبعیاتی قوانین کے تحت وجود میں آئی ہیں، اور انسانی دماغ بھی انہی قوانین کی پیداوار ہے۔ لیکن اس تصور میں ایک بڑا تضاد ہے۔ اگر دماغ خود بے ترتیب اور غیر منطقی عوامل کی پیداوار ہے، تو پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ منطقی استدلال اور حقائق تک پہنچنے کی صلاحیت رکھتا ہو؟

حمزہ تروتزس اپنی کتاب **The Divine Reality** میں اس تضاد کو ایک دل چسپ مثال کے ذریعے واضح کرتے ہیں:

فرض کریں دو بس ڈرائیور ہیں۔ ایک تجربہ کار ہے، جو راستے کا نقشہ دیکھ کر اپنی منزل تک پہنچتا ہے۔ دوسرا نابینا ہے، جو بغیر نقشے یا رہنمائی کے چلتا ہے۔ اگر نابینا ڈرائیور کبھی منزل پر پہنچ بھی جائے، تو یہ محض اتفاق ہوگا، نہ کہ اس کی کسی قابلیت کا نتیجہ۔ حمزہ تروتزس کے مطابق، نیچرلزم میں انسانی عقل کو اسی نابینا ڈرائیور کی طرح سمجھا جاسکتا ہے۔ یعنی اگر دماغ واقعی بے ترتیب عوامل کی پیداوار ہے، تو اس کی منطق اور استدلال بھی محض حادثاتی ہوگا، جس پر اعتماد ممکن نہیں۔

ارتقاء، عقل، اور سچائی

نیچرلزم اور ارتقاء کا ایک اور دعویٰ یہ ہے کہ انسانی دماغ ارتقائی عمل کے نتیجے میں وجود میں آیا۔ اس کے مطابق، عقل کا مقصد صرف بقا (survival) اور تولید ہے، نہ کہ حقیقت یا سچائی کی تلاش۔ لیکن اگر عقل کا ارتقاء صرف بقا کے لیے ہوا ہے، تو پھر یہ کیسے

ممکن ہے کہ یہ سچائی کو سمجھنے کی صلاحیت بھی رکھتی ہو؟
جان گرے اس تضاد کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتے ہیں:

"If the human mind has evolved in obedience to the imperatives of survival, what reason is there for thinking that it can acquire knowledge of reality, when all that is required in order to reproduce the species is that its errors and illusions are not fatal?"(1)

(ترجمہ: "اگر انسانی ذہن بقا کی ضروریات کے تحت ترقی پایا ہے، تو ہمیں یہ سوچنے کی کیا دلیل ہے کہ یہ حقیقت کا علم حاصل کر سکتا ہے، جب کہ نسل کی بقا کے لیے یہ کافی ہے کہ اس کی غلطیاں اور فریب مہلک نہ ہوں؟")
چارلس ڈارون کی تشویش:
یہ سوال صرف جدید فلسفیوں تک محدود نہیں۔ خود چارلس ڈارون نے بھی انسانی عقل پر شبہ ظاہر کیا۔
انہوں نے کہا:

"But then with me the horrid doubt always arises whether the convictions of man's mind, which has been developed from the mind of the lower animals, are of any value or at all

(1) The Closed Mind of Richard Dawkins

trustworthy. Would anyone trust in the convictions of a monkey's mind, if there are any convictions in such a mind?" (1)

ترجمہ: لیکن میرے ذہن میں ہمیشہ یہ ہولناک شبہ پیدا ہوتا ہے کہ انسان کے ذہنی اعتقادات، جو نچی مخلوقات کے ذہن سے ترقی یافتہ ہیں، کیا ان کی کوئی اہمیت یا اعتبار ہو سکتا ہے؟ کیا کوئی بندر کے ذہنی اعتقادات پر بھروسہ کرے گا، اگر ان میں کوئی اعتقاد موجود ہو؟

اعتراض: یہ کہا جا سکتا ہے کہ آپ نے انسانی عقل کے لیے "شعور" (Consciousness) کی ضرورت پر زور دیا، لیکن جدید دور میں ChatGPT اور دیگر مصنوعی ذہانت (AI) کے ماڈلز نہ صرف انسانوں کی طرح بات چیت کرتے ہیں بلکہ بعض اوقات زیادہ منطقی، مضبوط اور معقول دلائل پیش کرتے ہیں۔ ایسے میں آپ کا یہ دعویٰ کیسے قائم رہتا ہے کہ عقل کے لیے شعور کی ضرورت ہے؟

جواب: یہ اعتراض بظاہر معقول معلوم ہوتا ہے، لیکن اس کا گہرائی سے جائزہ لینے پر معلوم ہوتا ہے کہ مصنوعی ذہانت (AI) اور انسانی عقل کے درمیان بنیادی فرق موجود ہے، جو اس دعوے کو برقرار رکھتا ہے کہ انسانی شعور (Consciousness) محض طبیعی عوامل سے پیدا نہیں ہو سکتا۔

❑ مصنوعی ذہانت شعوری نہیں ہے:

مصنوعی ذہانت، جیسا کہ ChatGPT، اپنے "علم" اور "دلائل" کو پیشگی دیے گئے ڈیٹا، الگورتھمز، اور پروگرامنگ کی بنیاد پر فراہم کرتی ہے۔ یہ ماڈلز انسانی ذہن کے

شعوری تجربات (Conscious Experiences) نہیں رکھتے۔ ان کے پاس اپنی خواہش، خود ارادیت، یا اندرونی معانی (Intrinsic Meaning) کی صلاحیت نہیں ہوتی۔ یہ محض معلومات کو ترتیب دیتے ہیں اور انسانی دی گئی ہدایات کے مطابق جواب دیتے ہیں۔

¶ شعور اور تخلیقیت کی کمی:

ChatGPT یا کسی بھی مصنوعی ذہانت کے ماڈل میں تخلیقی شعور (Creative Consciousness) نہیں ہوتا۔ جوابات دینے کا عمل صرف ڈیٹا کے تجزیے اور ہدایات پر مبنی ہوتا ہے۔

مثال کے طور پر، اگر آپ ChatGPT سے یہ پوچھیں کہ زندگی کا حقیقی مقصد کیا ہے، تو یہ صرف مختلف فلسفیوں یا انسانوں کی دی گئی آراء کی بنیاد پر جواب دے گا، جبکہ اس کا اپنا کوئی نظریہ یا شعور نہیں ہوگا کہ وہ خود سے مقصد کی وضاحت کرے۔

¶ انسانی عقل اور مصنوعی ذہانت میں فرق:

مصنوعی ذہانت کسی مخصوص مسئلے کو حل کرنے کے لیے بنی ہے، لیکن اس میں وجودی شعور (Existential Consciousness) کی کمی ہوتی ہے۔ انسان اپنی عقل سے نہ صرف منطقی استدلال کرتا ہے بلکہ اخلاقی اقدار، جذبات، اور روحانی تجربات بھی رکھتا ہے۔

مصنوعی ذہانت انسان کے جذبات، نیت، یا شعوری ترجیحات کو "محسوس" نہیں کر سکتی، بلکہ صرف ظاہری معلومات کی ترتیب پیش کرتی ہے۔

اخلاقی اور روحانی معاملات:

مصنوعی ذہانت کے پاس اخلاقی اور روحانی شعور کی کمی ہے۔ یہ اچھائی اور برائی، انصاف اور ظلم جیسے معاملات میں انسانی شعور جیسا ادراک نہیں رکھتی، جو اس کے محدود ہونے کا ثبوت ہے۔

نتیجہ:

نیچرلزم اور الحاد عقل اور شعور کی وضاحت کرنے میں ناکام ہیں۔ اگر انسانی دماغ واقعی بے ترتیب اور حادثاتی عوامل کا نتیجہ ہے، تو اس کی استدلالی صلاحیت ناقابل اعتبار ہو جاتی ہے۔ اس کے برعکس، اسلام انسانی عقل کو خدا کا عطیہ سمجھتا ہے، جو انسان کو حقیقت اور حق کی تلاش کے لیے دی گئی ہے۔

یہ دلائل واضح کرتے ہیں کہ الحاد نہ صرف انسانی عقل کے لیے کوئی مضبوط بنیاد فراہم نہیں کرتا بلکہ خود تضادات کا شکار ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خدا کا وجود نہ صرف انسانی شعور کی وضاحت کرتا ہے بلکہ عقل کو ایک بلند اور معقول مقصد بھی فراہم کرتا ہے۔

خدا کے وجود کی دلیل

انسانی عقل ہمیشہ سے اس سوال میں الجھی رہی ہے کہ یہ کائنات کیسے وجود میں آئی؟ کیا یہ خود بخود وجود میں آگئی، یا اس کے پیچھے کوئی شعوری خالق موجود ہے؟ الحاد، خاص طور پر نیچرلزم، یہ کہتا ہے کہ کائنات کا وجود کسی خالق کی محتاجی کے بغیر، محض حادثاتی طور پر ہوا۔ لیکن جب ہم اس دعوے کو سائنس، فلسفے، اور منطق کی کسوٹی پر پرکھتے ہیں، تو یہ نظریہ خود اپنے ہی خلاف گواہی دیتا ہے۔

کائنات کی ابتدا اور بگ بینک کا نظریہ

بگ بینک تھیوری کے مطابق کائنات کا آغاز تقریباً 13.8 ارب سال پہلے ایک زبردست دھماکے سے ہوا۔ یہ نظریہ خود الحاد کے لیے ایک مسئلہ بن چکا ہے، کیونکہ اس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ کائنات کا آغاز ہوا تھا، یعنی یہ ابدی (eternal) نہیں ہے۔

لا محدودیت میں یہ کہنا ممکن نہیں کہ کوئی واقعہ کسی دوسرے واقعے سے پہلے ہوا ہے۔ وقت، جو دنوں پر مشتمل ہے، اگر لا محدود تعداد میں دن موجود ہوں تو آج کا دن کبھی نہ آتا کیونکہ لا محدود تعداد کے دن کبھی ختم نہیں ہو سکتے۔ لیکن چونکہ آج کا دن آیا ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ وقت اور کائنات کا آغاز ہوا ہے، اور کائنات ازلی نہیں ہے۔ جی ڈی ویلیمنز (م 1716ء) کہتے ہیں:

”اگر کوئی کتاب ہمیشہ سے موجود ہو اور ایک کاپی دوسری سے بنائی گئی ہو، تو یہ وضاحت کبھی مکمل نہیں ہوگی کہ یہ کتابیں کیوں لکھی گئیں اور کس نے لکھیں۔ اسی طرح، اگر ہم دنیا کو ابدی مان بھی لیں، تب بھی اس کے وجود کے لیے ایک حتمی وجہ، یعنی خدا، ضروری ہوگی۔ (۱)

قانون حرکیات (Thermodynamics)

اور اس سے حاصل ہونے والی دلیل

قانون حرکیات (Thermodynamics) وہ اصول ہیں جو توانائی اور حرارت کی حرکت، تبدیلی، اور تحفظ کو بیان کرتے ہیں۔ ان قوانین میں سے دوسرا قانون خاص طور پر ہمارے موضوع کے لیے اہم ہے۔ یہ قانون کہتا ہے کہ کسی بھی بند نظام میں، توانائی کی تبدیلی ہمیشہ ایک خاص ترتیب (order) سے بے ترتیبی (disorder) کی طرف جاتی ہے، جسے سائنس کی اصطلاح میں "اینٹروپی" (Entropy) کہا جاتا ہے۔ اس قانون کا مطلب یہ ہے کہ کائنات میں توانائی کے وسائل محدود ہیں، اور وقت کے ساتھ ان کا استعمال انہیں کم موثر بناتا ہے۔

دوسرے قانون کے مطابق، جب کوئی مادہ دباؤ میں آتا ہے تو اس کا درجہ حرارت بڑھ جاتا ہے۔ اس قانون کو ذہن میں رکھتے ہوئے، ہم کائنات کے لامحدود آغاز کے نظریے کا تجزیہ کر سکتے ہیں۔

اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ کائنات ہمیشہ سے موجود ہے اور یہ لامحدود عرصے سے عظیم دھماکوں (Big Bang) اور سکڑاؤ (Big Crunch) کے ایک سلسلے سے گزر رہی ہے، تو دوسرے قانون حرکیات کے مطابق، ہر بار کے دھماکے اور سکڑاؤ کے نتیجے میں کائنات کا درجہ حرارت مسلسل بڑھنا چاہیے۔ کیونکہ جب مادہ دباؤ میں آتا ہے، تو اس کا درجہ حرارت لازمی طور پر بڑھتا ہے۔

اب اگر یہ سلسلہ واقعی لامحدود ہوتا تو آج کائنات کا درجہ حرارت انتہائی زیادہ ہونا چاہیے تھا، جو مشاہدے کے بالکل برعکس ہے۔ موجودہ سائنسی مشاہدات کے مطابق،

کائنات کا درجہ حرارت تقریباً 3.5 کلوین ہے، جو انتہائی کم ہے اور ایک خاص آغاز کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ یہ بات ثابت کرتی ہے کہ کائنات کا ایک مخصوص لمحے میں آغاز ہوا، اور یہ لامحدود دھماکوں اور سکڑاؤ کا نتیجہ نہیں ہو سکتی۔

قانون حرکیات سے حاصل شدہ نتیجہ

قانون حرکیات کا دوسرا اصول نہ صرف کائنات کے لامحدود ہونے کے نظریے کو رد کرتا ہے بلکہ یہ اس بات کی بھی وضاحت کرتا ہے کہ کائنات کا آغاز ایک خاص ترتیب اور نظام کے ساتھ ہوا۔ یہ نظام اور ترتیب کسی بے ترتیب حادثے یا خود کار عمل کا نتیجہ نہیں ہو سکتے، بلکہ اس کے پیچھے ایک حکیم اور قادر خالق کا وجود ہونا ضروری ہے، جس نے اس کائنات کو ایک خاص حکمت اور منصوبے کے تحت تخلیق کیا۔ (۱)

لہذا اگر کائنات کا آغاز ہوا ہے، تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ ”پہلا دھماکہ“ کیسے اور کیوں ہوا؟ الحادی نظریے کے پاس اس سوال کا کوئی منطقی جواب نہیں۔

سر راجر پیٹرز نے اس بات کو واضح کرتے ہوئے کہا:

”بگ بینک کے دوران طبیعیات اور سائنس خود ختم ہو جاتی ہے، اور ہمیں ایک ایسی جگہ پر لے جاتی ہے جہاں کوئی طبیعیاتی قانون کام نہیں کرتا۔“

جب قوانین طبیعیات خود بگ بینک کے آغاز میں موجود نہ تھے، تو کائنات کے وجود کو بغیر کسی خالق کے کیسے سمجھا جاسکتا ہے؟ مزید یہ کہ سائنس بگ بینک سے پہلے کے سوال کا کوئی جواب فراہم نہیں کر سکتی تو خدا تک اس کی رسائی کیسے ہو؟

ماہرِ طبیعیات پال ڈیویس کہتے ہیں:

”کائنات کے قوانین، جن پر فطرت کا انحصار ہے، انتہائی منظم ریاضیاتی اصولوں پر مبنی ہیں۔ لیکن یہ قوانین کہاں سے آئے؟ اور ان کا یہ مخصوص ڈھانچہ کیوں ہے؟ جب میں نے اپنے ماہرِ طبیعیات ساتھیوں سے یہ سوال کیا، تو اکثر جواب ملا: 'یہ کوئی سائنسی سوال نہیں، یا 'کوئی نہیں جانتا۔ لیکن یہ کہنا کہ قوانین بغیر کسی وجہ کے موجود ہیں، عقل کے خلاف اور غیر سائنسی ہے۔ سائنس کا مقصد ہی یہ ہے کہ دنیا کو منطقی اور معقول انداز میں سمجھا جائے۔ اگر ہم اس تلاش کو بنیادی قوانین تک لے جا کر اچانک یہ کہیں کہ 'اب عقل کا سہارا نہیں لیا جاسکتا، تو یہ سائنس کا مذاق بنانے کے مترادف ہے۔ (۱)

اسٹیفن ہاکنگ کا اعتراف:

”یہ بہت مشکل ہو گا کہ یہ وضاحت کی جاسکے کہ کائنات نے اس طرح آغاز کیوں کیا، سوائے اس کے کہ یہ خدا کا عمل تھا۔ (۲)

کلامی کائناتی دلیل (Kalam Cosmological Argument)

اسلامی فلسفے میں کلامی کائناتی دلیل اس سوال کا معقول جواب فراہم کرتی ہے:

ہر وہ چیز جو وجود میں آتی ہے، اس کا کوئی سبب ہوتا ہے۔

کائنات وجود میں آئی، لہذا اس کا بھی کوئی سبب ہونا چاہیے۔

وہ سبب ایسا ہونا چاہیے جو خود کسی اور پر منحصر نہ ہو۔

اس لیے کہ ”کچھ بھی نہیں“ کسی چیز کو وجود میں نہیں لا سکتا۔ اسے اس طرح سمجھیں کہ

(1) Overman, A Case for the Existence of God, p. 42.

(2) A Brief History of Time.

اگر صفر کو صفر میں جمع کریں اور پھر مزید صفر جمع کریں، تو نتیجہ ہمیشہ صفر ہی رہے گا، تین نہیں۔ یعنی ”کچھ نہ ہونا“ کسی بھی شے کے وجود کا سبب نہیں بن سکتا۔ یہ دلیل ہمیں ایک ایسی ہستی کی طرف لے جاتی ہے جو ہر چیز کی علت ہے، لیکن خود کسی علت کی محتاج نہیں اور اسی کو ہم اللہ کہتے ہیں۔ اس دلیل کو اسماعیل لطیف حاجی نبی اولو نے اپنی کتاب **Does God Exist**؟ میں تفصیل سے بیان کیا ہے:

کائنات کے وجود کی ابتدا کسی ایسی ہستی سے ہوئی جو خود غیر مخلوق ہے، اور یہی ہستی خدا ہے۔ (۱)

یہی منطق سائنسی اصولوں سے بھی ہم آہنگ ہے۔ مشہور سائنسدان آئزک نیوٹن کے حرکت کے پہلے قانون کے مطابق:

”ہر جسم اپنی حالت میں رہتا ہے، جب تک کہ کوئی بیرونی قوت اس پر اثر نہ ڈالے۔ (۲)

لامتناہی تسلسل کا مسئلہ

ملحدین اکثر یہ سوال کرتے ہیں کہ اگر خدا نے کائنات کو بنایا، تو خدا کو کس نے بنایا؟ یہ سوال خود منطقی تضاد کا شکار ہے کیونکہ اگر ہر چیز کسی اور پر منحصر ہو، تو یہ سلسلہ کبھی ختم نہیں ہوگا۔

یہ تصور **Infinite Regress** کہلاتا ہے، جس کے تحت ہر چیز کسی نہ کسی سبب کی محتاج ہوتی ہے۔ لیکن اگر ایسا ہو تو کائنات کی ابتدا ممکن ہی نہیں ہو سکتی، کیونکہ کوئی نہ

(۱) حاجی نبی اولو، **Does God Exist?** ص 188

(۲) **NASA's: Laws of Motion**

کوئی پہلی علت (First Cause) ضروری ہے جو اس سلسلے کو شروع کرے۔
یہی علت ”واجب الوجود“ ہے، یعنی اللہ تعالیٰ، جو خود کسی پر منحصر نہیں۔

انسانی تجربات اور مشاہدات یہ بتاتے ہیں کہ ہر اثر کا کوئی نہ کوئی سبب ہوتا ہے۔
کائنات، جو ایک عظیم سلسلہ اسباب و اثرات پر مشتمل ہے، بھی یقیناً کسی بنیادی سبب کی
محتاج ہے جس نے اسے وجود میں لایا۔ اللہ تعالیٰ ایک اور مقام پر فرماتا ہے:

”کیا یہ بغیر کسی (خالق) کے پیدا ہو گئے؟ یا انہوں نے خود اپنے آپ کو پیدا کر لیا؟
یا انہوں نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا؟ بلکہ یہ یقین نہیں رکھتے۔ (۱)

ان آیات میں تین ممکنہ امکانات بیان کیے گئے ہیں:

1. کائنات بغیر کسی خالق کے وجود میں آئی۔

2. انسانوں نے خود اپنے آپ کو پیدا کیا۔

3. کائنات کو کسی نے تخلیق کیا۔

پہلے دو امکانات کو عقل و منطق کے ذریعے رد کیا جاسکتا ہے۔ پہلا امکان، کہ
کائنات بغیر کسی خالق کے وجود میں آئی، عقلی طور پر ناممکن ہے کیونکہ ہمارا روزمرہ کا تجربہ
یہ بتاتا ہے کہ ہر چیز کسی نہ کسی سبب سے وجود میں آتی ہے۔ دوسرا امکان، کہ انسانوں
نے خود کو تخلیق کیا، ایک واضح تضاد پر مبنی ہے کیونکہ کوئی چیز اپنے وجود سے پہلے اپنے
آپ کو پیدا نہیں کر سکتی۔ اس لیے صرف تیسرا امکان باقی رہ جاتا ہے: کہ کائنات کو ایک
عظیم خالق نے تخلیق کیا۔

ابن حجر رحمہ اللہ کی تشریح

امام ابن حجر رحمہ اللہ نے ان آیات کی تشریح میں امام خطابی رحمہ اللہ کا قول نقل کیا ہے:

”کیا یہ بغیر کسی خالق کے پیدا ہو گئے؟ یہ ناممکن ہے کیونکہ ہر مخلوق کا ایک خالق ہونا ضروری ہے۔ اگر وہ خالق کا انکار کریں تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ انہوں نے خود اپنے آپ کو پیدا کیا، اور یہ اس سے بھی زیادہ نامعقول اور جھوٹا دعویٰ ہے، کیونکہ ایک غیر موجود شے کسی شے کو کیسے پیدا کر سکتی ہے؟۔ (۱)

بغیر خالق کے کائنات کا وجود کیوں ناممکن ہے؟

بگ بینک سے پہلے نہ وقت تھا، نہ جگہ، اور نہ ہی کوئی طبیعیاتی قوانین (laws of physics) موجود تھے۔ الحاد کے مطابق، یہ سب کچھ خود بخود وجود میں آیا، لیکن یہ دعویٰ غیر معقول اور منطقی طور پر ناقابل قبول ہے۔

قوانین طبیعیات، جو کہ کائنات کے ہر پہلو کو منظم کرتے ہیں، جیسے کشش ثقل (gravity)، روشنی کی رفتار، اور دیگر بنیادی قوتیں، خود کسی شعوری ہستی کے بغیر وجود میں نہیں آسکتے۔ اگر یہ قوانین محض حادثاتی طور پر وجود میں آئے ہوتے، تو یہ اتنے منظم، مستقل، اور متوازن نہ ہوتے۔ مثال کے طور پر، اگر آپ کہیں کہ کسی پیچیدہ کتاب کے الفاظ اور جملے حادثاتی طور پر ترتیب پا گئے ہیں، تو یہ بات غیر منطقی ہوگی۔ اسی طرح، کائنات کے قوانین، جو بے حد پیچیدہ اور مربوط ہیں، خود بخود وجود میں نہیں آسکتے۔

لہذا، قوانین طبیعیات کا وجود ایک ایسی شعوری ہستی کا محتاج ہے جو ان قوانین کو

وجود میں لائے اور ان کا تسلسل برقرار رکھے۔ یہ خالق وہی ہستی ہے جو خود کسی اور کی محتاج نہیں اور تمام کائنات کی بنیاد ہے۔

کیا انہوں نے غور نہیں کیا کہ آسمان اور زمین جڑے ہوئے تھے، پھر ہم نے انہیں جدا کیا؟۔ (۱)

اگر کائنات کی ابتدا ہوئی ہے، تو یہ ثابت ہوتا ہے کہ یہ ہمیشہ سے موجود نہیں تھی۔ کسی چیز کا آغاز خود اس بات کی گواہی دیتا ہے کہ وہ کسی اور کے ذریعے وجود میں آئی ہے۔ جیسا کہ پہلے ذکر ہوا، اگر ہر چیز کسی اور چیز پر منحصر ہو، تو یہ سلسلہ کبھی ختم نہ ہوگا۔ لہذا، ایک ایسی ہستی ضروری ہے جو ہر چیز کی علت ہو، لیکن خود علت کی محتاج نہ ہو۔ فرض کریں، کوئی پوچھے:

یہ کائنات کس نے بنائی؟

جواب: خدا نے۔

اگلا سوال: خدا کو کس نے بنایا؟

جواب: خدا کو کسی اور خدا نے بنایا۔

پھر سوال ہوگا: اُس خدا کو کس نے بنایا؟

یہ سلسلہ لامتناہی طور پر جاری رہ سکتا ہے، لیکن یہ تصور غیر منطقی ہے، کیونکہ اگر کوئی ایسی ہستی نہ ہو جو ”خود مخلوق نہ ہو“ اور ہر چیز کی خالق ہو، تو کائنات کی وضاحت کبھی ممکن نہیں ہو سکتی۔

پہلی علت کو نہ جاننا: خدا کے انکار کی دلیل نہیں

ایک اہم سوال جو اکثر ذہنوں میں آتا ہے وہ یہ ہے کہ اگر ہم یہ سمجھ بھی لیں کہ کائنات کو ایک "پہلی علت" (First Cause) کی ضرورت ہے، تو ہمیں کیسے معلوم ہوگا کہ یہ علت خدا ہی ہے؟ یہ سوال بظاہر روزنی معلوم ہوتا ہے، مگر اس کا انکار خدا کے وجود کو رد کرنے کی معقول بنیاد فراہم نہیں کرتا۔ آئیے اس سوال کو منطقی طور پر سمجھتے ہیں۔

1. پہلی علت کا تصور اور انسانی عقل کی محدودیت

انسانی عقل کائنات کے مظاہر، قوانین، اور ترتیب کو دیکھ کر اس نتیجے پر پہنچتی ہے کہ ہر چیز کسی نہ کسی علت کی مرہون منت ہے۔ کائنات کا آغاز، اس کا نظم و ضبط، اور اس کے قوانین ایک "پہلی علت" کے محتاج ہیں۔ لیکن اگر ہم یہ نہ سمجھ پائیں کہ یہ "پہلی علت" کون ہے یا اس کی ماہیت کیا ہے، تو کیا یہ اس کے انکار کی دلیل بن سکتی ہے؟ یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے کوئی شخص یہ مانے کہ ایک پیچیدہ عمارت کسی معمار کے بغیر ممکن نہیں، مگر یہ نہ جان سکے کہ معمار کون تھا۔ کیا اس کے معمار کے وجود کا انکار درست ہوگا؟ یقیناً نہیں۔

2. عدم علم، انکار کی دلیل نہیں

کسی چیز کو مکمل طور پر نہ سمجھ سکرنا، یا اس کی تفصیلات سے ناواقف ہونا، اس کے وجود کو جھٹلانے کی دلیل نہیں بن سکتا۔ مثال کے طور پر، ہم میں سے بیشتر لوگ ایٹم کی ساخت یا برقی توانائی کے عمل کو مکمل طور پر نہیں سمجھ سکتے، مگر کیا یہ ان کے وجود کے انکار کی بنیاد فراہم کرتا ہے؟ اسی طرح، اگر کوئی شخص "پہلی علت" کی حقیقت کو پوری طرح نہ سمجھ سکے، تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ علت موجود نہیں۔

نتیجہ: خدا کی وجود کی وضاحت

الحاد کائنات کے آغاز کی معقول وضاحت فراہم کرنے میں ناکام ہے۔ بگ بینک، قوانین طبیعیات، اور کائنات کے محدود ہونے جیسے حقائق صرف ایک شعوری خالق کی موجودگی کے ساتھ ہی قابل فہم ہیں۔

کائنات کے نازک توازن (Fine-Tuning)

خدا کے وجود کا ثبوت

ہم جس کائنات میں رہتے ہیں، وہ حیرت انگیز طور پر ایک نازک توازن (Fine-Tuning) پر قائم ہے، جو اس بات کا اشارہ دیتا ہے کہ یہ محض اتفاقیہ عمل کا نتیجہ نہیں بلکہ ایک اعلیٰ منصوبہ بندی اور حکمت کا ثمر ہے۔ کائنات کے قوانین اور ہماری زمین کی خصوصیات اس حد تک درست اور متوازن ہیں کہ اگر ان میں معمولی سی بھی تبدیلی ہو جاتی تو زندگی کا وجود ممکن نہ ہوتا۔

زمین کے سائز کی اہمیت

زمین کا سائز ایک مثالی مثال ہے۔ اگر ہماری زمین موجودہ سائز سے ذرا چھوٹی ہوتی، تو اس کا مقناطیسی میدان (Magnetic Field) کمزور ہو جاتا۔ اس کمزور میدان کی وجہ سے سورج سے آنے والی شعاعیں اور تابکار ذرات (Solar Wind) زمین کے ماحول کو ختم کر دیتے، اور ہماری دنیا مریخ کی طرح بے جان سیارہ بن جاتی۔ دوسری طرف، اگر زمین کا سائز تھوڑا بڑا ہوتا، تو کشش ثقل (Gravity) اتنی زیادہ ہوتی کہ کاربن ڈائی آکسائیڈ اور میتھین جیسی گیسیں ماحول میں پھنس جاتیں، اور ہماری ہوا

اتنی گھنی ہو جاتی کہ سانس لینا ناممکن ہو جاتا۔

جیسا کہ گونزالز اور چرڈز اپنی کتاب **The Privileged Planet** میں لکھتے ہیں:

” زمین شاید اتنی ہی بڑی ہو سکتی تھی جتنی ایک رہنے کے قابل سیارہ ہو سکتا ہے۔ ”

پانی اور سورج کے فاصلہ کی درستگی

زمین پر زندگی کے لیے پانی لازمی ہے۔ اگر زمین سورج سے تھوڑی قریب ہوتی، تو زیادہ تر پانی بخارات بن کر ختم ہو جاتا، اور اگر تھوڑی دور ہوتی، تو پانی جم کر برف بن جاتا۔ دونوں صورتوں میں زندگی ممکن نہ ہوتی۔

اسٹیفن ہاکنگ کا اعتراف

اسٹیفن ہاکنگ اپنی کتاب **A Brief History of Time** میں کہتے ہیں:

” اگر کائنات کی کثافت میں 0.00000000000001 فیصد بھی فرق ہوتا تو

ستارے اور کہکشائیں وجود میں نہ آتیں۔ اگر بگ بینک کے بعد کائنات کے پھیلاؤ کی رفتار معمولی سی بھی کم ہوتی، تو یہ اپنی موجودہ شکل اختیار کرنے سے پہلے ہی ختم ہو جاتی۔ (۱)

یہ حیرت انگیز اعداد و شمار اس بات کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ کائنات کو ایک مخصوص ترتیب اور مقصد کے تحت بنایا گیا ہے۔

ہاکنگ مزید لکھتے ہیں:

” یہ سمجھنا بہت مشکل ہو گا کہ کائنات کا آغاز اس خاص طریقے سے کیوں ہوا، سوائے اس کے کہ یہ ایک خدا کے عمل کا نتیجہ ہو، جس نے ایسے مخلوقات پیدا کرنے کا ارادہ کیا جو ہم جیسے ہوں۔

کائنات کے نازک توازن کی مثالوں میں سے ایک طاقتور نیوکلیر فورس (Strong Nuclear Force) ہے، جو پروٹونز اور نیوٹرونز کو ایک ساتھ جوڑ کر ہر ایٹم کے مرکزے کو قائم رکھتی ہے۔ اگر یہ طاقت 2 فیصد کمزور ہوتی، تو یہ پروٹونز اور نیوٹرونز کو جوڑنے کے قابل نہ ہوتی، اور تمام ایٹمز ختم ہو جاتے۔ اس کے نتیجے میں، کائنات میں صرف ہائیڈروجن باقی رہ جاتی، اور زندگی ممکن نہ ہوتی۔ دوسری طرف، اگر یہ طاقت صرف 0.3 فیصد زیادہ ہوتی، تو پروٹونز اور نیوٹرونز ایک دوسرے سے حد سے زیادہ جڑ جاتے، اور بڑے عناصر بننے لگتے، جس کی وجہ سے ہائیڈروجن مکمل طور پر ختم ہو جاتی۔ یہ درستی بگ بینک کے بعد کائنات کے ابتدائی لمحوں میں قائم ہوئی اور آج تک بغیر کسی تبدیلی کے موجود ہے۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے: یہ سب اتنا درست اور متوازن کیسے ہوا؟ کیا یہ محض ایک اتفاقیہ عمل تھا، یا کسی اعلیٰ عقل کی منصوبہ بندی؟

کائنات کا نازک توازن: اتفاقیہ یا منصوبہ بندی؟

یہ سوچنا مشکل ہے کہ اس قدر درستی اور توازن محض اتفاقیہ ہو سکتا ہے۔ اگر کائنات کے بنیادی قوانین یا مستقلات (Constants) میں معمولی سی بھی تبدیلی ہوتی، تو نہ کائنات وجود میں آتی اور نہ زندگی۔ پال ڈیوس اپنی کتاب **God and the New Physics** میں لکھتے ہیں:

”کائنات کے موجودہ ڈھانچے کو دیکھ کر یہ تاثر قائم کرنا مشکل ہے کہ یہ اتفاقیہ ہو سکتا ہے۔ قدرت کے بنیادی اعداد و شمار میں معجزاتی ہم آہنگی کائنات کے ایک اعلیٰ ڈیزائن کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ (۱)

ڈاکٹر سینڈیج، جو ایک ماہر فلکیات تھے، نے اپنی تقریر میں کہا کہ گزشتہ پچاس سالوں میں فلکیات اور فلکیاتی طبیعیات میں ایک غیر معمولی تبدیلی رونما ہوئی ہے۔ انہوں نے کہا کہ آسمان کی تحقیق کے دوران، کچھ ماہرین فلکیات اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ ”تخلیق کے واقعے“ کے شواہد موجود ہیں۔ انہوں نے ایک مکمل مادی اور عقلی سائنسدان کے طور پر اپنی پوزیشن سے ہٹتے ہوئے اعتراف کیا کہ اس ”فوق الفطرت“ واقعے نے ان کے اندر اس یقین کو جنم دیا کہ کائنات میں ایک ڈیزائن موجود ہے۔ ان کا کہنا تھا کہ کائنات میں ایک نظم اور ترتیب موجود ہے، اور تمام سائنسدان، اپنی فیلڈ کی حیرت انگیز اندرونی کنکشنز کو دیکھ کر، اس بات پر غور کرتے ہیں کہ یہ سب کچھ ایسا کیوں ہے۔ (۱)

یہ کہنا کہ یہ سب کچھ خود بخود ہوا، ایسا ہی ہے جیسے کہنا کہ شیکسپیر کے ڈرامے، یا اہرام مصر، یا گریٹ وال آف چائنا خود بخود وجود میں آ گئے۔ کچھ چیزیں اتفاقیہ نہیں ہو سکتیں، اور کائنات ان میں سے ایک ہے۔

نتیجہ: کائنات کے نازک توازن کو دیکھ کر یہ واضح ہوتا ہے کہ یہ ایک بے ترتیب حادثہ نہیں بلکہ ایک عظیم خالق کی حکمت عملی کا نتیجہ ہے۔ یہ دلائل اس بات کو مضبوط کرتے ہیں کہ کائنات کا وجود ایک اعلیٰ عقل کے بغیر ممکن نہیں۔

زندگی کا وجود: غیر حیات سے حیات تک کا سفر

زندگی کے آغاز سے متعلق ایک نظریہ جسے ”ایوینیوٹنس“ کہا جاتا ہے، یہ تصور پیش کرتا ہے کہ زندگی غیر جاندار مادوں سے خود بخود وجود میں آ گئی، بغیر کسی خالق یا منصوبہ بندی کے۔

(1) Stephen Meyer, Return of the God Hypothesis, Harper One, 2021, S: 108

ایو جینیٹکس کے مطابق، زمین کے ابتدائی حالات میں موجود مختلف کیمیکل اور عناصر، جیسے پانی، ہائیڈروجن، اور کاربن، حادثاتی طور پر ایسے پیچیدہ مالیکیولز (مثلاً ڈی این اے) میں تبدیل ہو گئے ہوں جو زندگی کی بنیاد ہیں۔ یہ نظریہ یوں سمجھا جاسکتا ہے جیسے کوئی دعویٰ کرے کہ کچرے کے ڈھیر میں موجود لوہے اور پرزے خود بخود جڑ کر ایک مکمل گاڑی بن جائیں۔ یہی بات ایو جینیٹکس زندگی کے حوالے سے پیش کرتا ہے، کہ غیر جاندار مادہ بغیر کسی خالق یا منصوبہ بندی کے، اچانک زندہ جاندار میں تبدیل ہو گیا۔ تاہم، اس نظریے کے حق میں اب تک کوئی ٹھوس اور حتمی سائنسی ثبوت فراہم نہیں کیا جاسکا۔

زندگی کی ابتدا: دہریوں کی خاموشی اور خالق کی دلیل

جب دہریوں سے زندگی کے بارے میں بات کی جاتی ہے تو وہ فوراً ارتقاء (evolution) کی بحث چھیڑ دیتے ہیں، لیکن یہ بات بھول جاتے ہیں کہ ارتقاء کی بحث تب معنی رکھتی ہے جب ہم یہ سمجھ لیں کہ غیر جاندار (non-living) سے جاندار (living) کیسے وجود میں آیا؟ یہ سوال، جسے ایو جینیٹکس (Abiogenesis) کہا جاتا ہے، زیادہ اہمیت رکھتا ہے کیونکہ یہ زندگی کی اصل کو سمجھنے کی بنیاد فراہم کرتا ہے۔ دہریے اکثر اس سوال سے بچنے کی کوشش کرتے ہیں کیونکہ ان کے پاس اس کا کوئی واضح یا سائنسی جواب نہیں۔ وہ ارتقاء کو زندگی کے آغاز کی وضاحت کے طور پر پیش کرتے ہیں، حالانکہ ارتقاء زندگی کے بعد کے مراحل کو بیان کرتا ہے، نہ کہ زندگی کے وجود کی ابتدا کو۔ ہمیں سب سے پہلے ان سے یہ سوال کرنا چاہیے: ”زندگی کا آغاز کیسے ہوا؟“ ارتقاء کی بحث تب تک فضول ہے جب تک یہ وضاحت نہ ہو کہ زندگی نے وجود کیسے پایا۔

ملر - یوری تجربہ اور اس کے محدود نتائج

1953 میں دو سائنسدانوں، اسٹینلی ملر اور ہیری ولڈ یوری، نے ایک تجربہ کیا جس کا مقصد زمین کے ابتدائی حالات میں زندگی کے ممکنہ آغاز کو سمجھنا تھا۔ انہوں نے ایک تجرباتی نظام بنایا جو ابتدائی زمین کے ماحول کو ظاہر کرتا تھا۔ اس میں پانی، میتھین، امونیا اور ہائیڈروجن گیس کو شامل کیا گیا، اور ان پر بجلی کے چمکنے کی صورت میں مصنوعی بجلی گرائی گئی، جو کہ ابتدائی زمین پر بجلی کے طوفانوں کی نمائندگی کرتا تھا۔

کچھ دنوں بعد، اس تجربے سے امینو ایسڈز بنے، جو زندگی کے لیے ضروری پروٹینز کی بنیادی اکائیاں ہیں۔ اس دریافت نے سائنسی دنیا میں ہلچل مچادی اور اسے غیر جاندار مادوں سے زندگی کے آغاز کی طرف ایک اہم قدم سمجھا گیا۔

لیکن کیا یہ واقعی زندگی کے آغاز کو ثابت کرتا ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ یہ تجربہ صرف امینو ایسڈز بنانے تک محدود رہا۔ اس سے یہ ہرگز ثابت نہیں ہوا کہ یہ امینو ایسڈز کس طرح مزید پیچیدہ مالیکیولز، جیسے ڈی این اے یا آراین اے، میں تبدیل ہو سکتے ہیں، اور پھر یہ کہ وہ مالیکیولز ایک مکمل جاندار خلیے کی شکل اختیار کر سکتے ہیں۔

70 سال گزر جانے کے باوجود، کوئی حقیقی پیش رفت نہیں ہوئی

سائنس نے اس تجربے سے آگے بڑھ کر زندگی کے آغاز کو سمجھنے کی کوشش کی، لیکن آج بھی سائنس اسی جگہ کھڑی ہے جہاں ملر اور یوری نے شروعات کی تھی۔ صرف کیمیکلز کی موجودگی زندگی کو تشکیل دینے کے لیے کافی نہیں، کیونکہ جاندار خلیے محض ایک مادہ نہیں بلکہ معلومات (DNA)، توانائی کے نظام، اور خود کو برقرار رکھنے والے عملوں کا مجموعہ ہے۔ نائٹروجن، ہائیڈروجن، امونیا، یا امینو ایسڈز، نہ تو خود تقسیم ہو سکتے ہیں، نہ تولید کر

سکتے ہیں، اور نہ ہی وہ جانداروں کی طرح کسی قسم کی حیاتیاتی سرگرمی انجام دے سکتے ہیں۔ اگر زندگی کے بنیادی مالیکیولز خود سے زندگی میں تبدیل نہیں ہو سکتے، تو یہ کہنا کہ ”اتفاقہ عمل سے زندگی وجود میں آئی“ سائنس اور منطق کے خلاف ہے۔

ایو جینیٹکس اور ارتقاء کا مغالطہ

جب ہم ”زندگی کی ابتدا“ کے نظریات پر بات کرتے ہیں تو اکثر ”ایو جینیٹکس“ کی اصطلاح استعمال کی جاتی ہے۔ یہ اصطلاح اسی عمل کو بیان کرتی ہے جس کے تحت غیر جاندار عناصر کسی طرح اتفاقاً آپس میں جڑ کر ایک زندہ یک خلوی جاندار پیدا کر دیتے ہیں۔

لیکن ایک حیرت انگیز اور عجیب بات یہ ہے کہ جب ہم ”ایو جینیٹکس“ کو مختلف لغات میں دیکھتے ہیں تو ہمیں ایک خاص تضاد نظر آتا ہے۔ مثلاً، آکسفورڈ ڈکشنری میں ”ایو جینیٹکس“ کو یوں بیان کیا گیا ہے:

“The original evolution of life or living organisms from inorganic or inanimate substances.”

(زندگی یا جانداروں کی ابتدا کا وہ ارتقاء جو غیر نامیاتی یا غیر جاندار مادوں سے ہوا ہو۔)

اسی طرح، میریم-ویبسٹر ڈکشنری میں بھی ”ایو جینیٹکس“ کو یوں بیان کیا گیا ہے:

“A theory in the evolution of early life on earth: organic molecules and subsequent simple life

forms first originated from inorganic substances.”

(زمین پر زندگی کی ابتدا کے ارتقاء کا ایک نظریہ: نامیاتی مالیکیولز اور بعد میں پیدا ہونے والی سادہ زندگی کی اشکال غیر نامیاتی مادوں سے وجود میں آئیں۔) ویکپیڈیا بھی اس غلط اور گمراہ کن حرکت کا مرتکب ہے۔ وہ کہتا ہے:

“While the details of this process are still unknown, the prevailing scientific hypothesis is that the transition from non-living to living entities was not a single event, but an evolutionary process of increasing complexity that involved molecular self-replication, self-assembly, autocatalysis, and the emergence of cell membranes.”

(اگرچہ اس عمل کی تفصیلات ابھی تک معلوم نہیں ہیں، لیکن غالب سائنسی نظریہ یہ ہے کہ غیر جاندار سے جاندار وجود میں تبدیلی ایک واحد واقعہ نہیں تھا، بلکہ پیچیدگی میں بڑھتے ہوئے ارتقائی عمل کا نتیجہ تھا، جس میں مالیکیولز کی خودنقل بنانا، خود جمع ہونا، خود کار عمل انگیزی، اور غلیاتی جھیلوں کا ظہور شامل تھے۔)

ایوولوشن اور ایوولوشن دو الگ موضوعات ہیں، لیکن بعض ڈکشنریاں ایوولوشن کی تعریف میں ایوولوشن کو شامل کر دیتی ہیں، جو کہ ایک بڑی غلطی ہے۔ ایوولوشن زندگی کے آغاز کی وضاحت کرنے کی کوشش کرتا ہے، یعنی غیر جاندار مادوں سے زندگی کی تخلیق کیسے ہوئی۔ اس کا تعلق ان ابتدائی حالات سے ہے جب زندگی پہلی بار وجود میں آئی۔ دوسری طرف، ایوولوشن زندگی کے ارتقاء کا نظریہ ہے، جو

پہلے سے موجود زندگی کی تبدیلیوں اور ترقی کو بیان کرتا ہے۔
جب ہم آئیو جینیٹکس کی تعریف میں ایوولیوشن کو شامل کرتے ہیں، تو یہ دونوں تصورات کے درمیان فرق کو دھندلا دیتا ہے۔ اگر زندگی کا وجود ہی نہ ہو، تو اس کے ارتقاء کی بات کیسے کی جاسکتی ہے؟ یہ ایک بنیادی غلطی ہے۔
اس کے علاوہ، آئیو جینیٹکس کی تعریف میں ایوولیوشن کو شامل کرنا ایک گمراہ کن عمل بھی ہے، جو مادی نظریے کو مضبوط کرنے کے لیے کیا جاتا ہے۔ یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی جاتی ہے کہ زندگی کے آغاز اور ارتقاء کا ایک ہی سائنسی حل موجود ہے، حالانکہ حقیقت میں دونوں موضوعات کے لیے علیحدہ دلائل اور تحقیقات درکار ہیں۔ لہذا، آئیو جینیٹکس کی تعریف میں ایوولیوشن کو شامل کرنا منطقی اور سائنسی دونوں لحاظ سے غلط ہے۔

فطرت اللہ: خدا کے وجود کی دلیل

انسانی دل و دماغ میں خدا کے وجود کا احساس ایک فطری جبلت ہے، جو کسی نبی کی رہنمائی یا وحی کے بغیر بھی موجود ہوتی ہے۔ تاریخ میں ہر تہذیب، زبان اور جغرافیائی خطے نے کسی نہ کسی اعلیٰ ہستی یا خدا کو تسلیم کیا ہے۔ اسلامی اصطلاح میں یہ احساس ”فطرت اللہ“ کہلاتا ہے، جو اس عہد سے جڑا ہوا ہے جو اللہ تعالیٰ نے دنیا کی تخلیق سے پہلے تمام انسانوں سے لیا تھا۔

اللہ فرماتا ہے: ”جب آپ کے رب نے بنی آدم کی پشتوں سے ان کی اولاد کو نکالا اور انہیں خود ان کے اوپر گواہ بنایا (اور پوچھا)، کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟ تو سب نے کہا، کیوں نہیں، ہم گواہی دیتے ہیں۔ (۱)“

مفسر السدی (745ء) اس آیت کی وضاحت میں فرماتے ہیں:

”دنیا میں کوئی انسان ایسا نہیں جو اپنے رب کو نہ پہچانتا ہو، اور اگر کوئی شرک کرتا ہے تو وہ یہی کہتا ہے کہ یہ تو ہمارے آبا و اجداد کی راہ ہے۔“

یہ فطری رجحان انسان کو ہمیشہ کسی اعلیٰ ہستی کی تلاش پر آمادہ کرتا ہے۔ انسانی فطرت، جیسا کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا، ابتدا میں بالکل صاف اور خدا کی وحدانیت پر ہوتی ہے:

ہر بچہ فطرت پر پیدا ہوتا ہے۔ پھر اس کے والدین اسے یہودی، عیسائی یا مجوسی بنادیتے ہیں، جیسے جانور اپنے بچے کو صحیح سالم پیدا کرتا ہے۔ کیا تم اس میں کوئی نقص دیکھتے ہو؟ (۱)

ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ”خالق کا وجود انسانی فطرت کا ایک بنیادی حصہ ہے، لیکن بعض لوگ اپنی فطرت کو اس حد تک بگاڑ دیتے ہیں کہ انہیں اللہ کے وجود کو سمجھنے کے لیے دلائل کی ضرورت پڑتی ہے۔ علمائے کلام کے مطابق، اللہ کے وجود کا علم کبھی فطری طور پر حاصل ہوتا ہے اور کبھی دلیل کے ذریعے۔ (۲)

حالیہ تحقیق سے بھی یہ بات واضح ہوئی ہے کہ خدا پر یقین انسانی جینیات کا حصہ ہو سکتا ہے۔

Dean Hamer نے اپنی کتاب **The God Gene** میں وضاحت کی ہے کہ خدا پر یقین انسانی فطرت میں جینیاتی سطح پر شامل ہو سکتا ہے:

(۱) صحیح البخاری، 94:2# 1358-

(۲) ابن تیمیہ، مجموع الفتاویٰ، 328:16-

یہ ممکن ہے کہ ایمان یا خدا پر یقین انسانی جینیات کا حصہ ہو، جو فطری طور پر انسان میں موجود ہے۔ (۱)

قرآن پاک بھی اس فطری احساس کی تصدیق کرتا ہے:
آپ دین کی طرف پورے خلوص سے رخ کریں، یہی اللہ کی فطرت ہے جس پر
اس نے انسانوں کو پیدا کیا۔ (۲)

مشکل حالات میں فطرت کا اظہار

جب انسان کسی شدید مصیبت میں مبتلا ہوتا ہے تو اس کی فطرت خود بخود خدا کی طرف رجوع کرتی ہے۔ حتیٰ کہ وہ لوگ جو عام حالات میں دہریہ ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں، خطرے کے وقت خدا کو پکارتے ہیں۔

اللہ فرماتا ہے: ”جب وہ کشتی میں سوار ہوتے ہیں تو خالص اللہ کو پکارتے ہیں، لیکن جب وہ انہیں محفوظ طریقے سے خشکی تک پہنچا دیتا ہے تو فوراً شرک کرنے لگتے ہیں۔ (۳)
یہ قدرتی دعا اور رجوع اس بات کا ثبوت ہے کہ انسان کے اندر ایک فطری احساس موجود ہے، جو اس کے خالق کے وجود کی گواہی دیتا ہے۔

امام غزالی (1111ء) اپنی کتاب المنقذ من الضلال میں انسانی فطرت میں موجود اس رجحان کا ذکر کرتے ہیں، جو انسان کو اشیاء کی حقیقت جاننے کی طرف مائل کرتا ہے۔ وہ اسے ”پیماس“ (تعطش) کہتے ہیں، جو اس وقت تک نہیں بجھتی جب تک

(1) Dean Hamer, The God Gene: How Faith Is Hardwired into Our Genes (New York: Doubleday, 2004)

(۲) سورة الروم: 30۔ (۳) سورة العنكبوت: 65۔

انسان اپنے وجود کے مقصد اور حقیقت کو نہ جان لے۔

امام غزالی کے مطابق:

”عقل خدا کی معرفت تک پہنچنے کا ذریعہ ضرور ہے، لیکن اس کے بعد ایک اور دروازہ کھلتا ہے، جو دل میں خدا کی معرفت کا نور پیدا کرتا ہے۔ (۱)
یہی وجہ ہے کہ اسلام میں معرفت کو محض علمی معلومات نہیں بلکہ دل میں پیدا ہونے والے نور سے تعبیر کیا گیا ہے۔ امام مالک (795ء) فرماتے ہیں:
علم زیادہ اقوال یاد کرنے کا نام نہیں، بلکہ یہ وہ روشنی ہے جو اللہ دل میں پیدا کرتا ہے۔ (۲)

دنیا میں موجود دلائل خدا کے وجود پر مختلف زبانوں اور آوازوں میں خالق کی نشانیاں:

امام مالک رحمہ اللہ (وفات 795ء) سے خلیفہ ہارون الرشید نے خالق کے وجود کے بارے میں سوال کیا۔ امام مالک نے جواب دیا:
”مخلوقات کی مختلف زبانوں، آوازوں اور ان کی متنوع خوش الحانیوں میں خالق کی نشانیاں تلاش کریں۔ (۳)

(۱) المنقذ من الضلال، ص 182، دار الکتب الحدیثہ، 1972۔

(۲) (القاضی عیاض، الالماع الى معرفة اصول الرواة والسماع، قاہرہ: دار التراث،

1970ء، ص 217)

(۳) ابن کثیر، تفسیر القرآن العظیم، ص 106۔

مختلف مخلوقات کی تخلیق میں خالق کی حکمت

امام شافعی رحمہ اللہ (وفات 820ء) سے خالق کے وجود کے بارے میں سوال کیا گیا۔ انہوں نے جواب دیا:

”بیری کے درخت کے پتوں کا ذائقہ ایک جیسا ہوتا ہے۔ کیڑے اسے کھاتے ہیں اور ریشم پیدا کرتے ہیں، مکھی اسے کھاتی ہے اور شہد بناتی ہے، بکری، اونٹ اور گائے اسے کھاتے ہیں اور اولاد پیدا کرتے ہیں، اور ہرن اسے کھاتا ہے اور کستوری پیدا کرتا ہے۔ یہ سب کچھ ایک ہی چیز سے پیدا ہوتا ہے۔ (۱)

زمین کی تخلیقات میں نشانیاں

زمین سے نکلنے والے مختلف قسم کے جانور، پودے، اور پھل، جن کے ذائقے، خوشبوئیں، اشکال، اور رنگ مختلف ہیں، جبکہ ان سب کی نشوونما ایک ہی مٹی اور پانی سے ہوتی ہے، خالق کی موجودگی اور اس کی حکمت و قدرت کی واضح نشانیاں ہیں۔ ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

یہ بہتے دریا، زمین سے پیدا ہونے والے مختلف قسم کے جانور اور پودے، جن کے ذائقے، خوشبوئیں، اشکال اور رنگ مختلف ہیں، یہ سب کچھ خالق کی قدرت، حکمت، رحم اور مہربانی کا مظہر ہیں۔ یہ سب اس کی عظمت اور بے نیازی کی نشانیاں ہیں۔ زمین و آسمان میں کوئی اس کے برابر نہیں۔ (۲)

(۱) ابن کثیر، تفسیر القرآن العظیم، ص 106-107۔

(۲) ابن کثیر، تفسیر القرآن العظیم، جلد 1، ص 107۔

امام ابو حنیفہؒ کے اقوال سے یہ بات مکمل طور پر واضح ہوتی ہے کہ انسان کو اپنی عقل اور فطرت کے ذریعے اللہ کی وحدانیت کو پہچاننے کا مکلف قرار دیا گیا ہے۔ ان کے نزدیک یہ عقل سلیم کی عطا اور فطری اصول ہے کہ مخلوق اپنے خالق کو پہچانے، خواہ اس پر کوئی رسول مبعوث کیا گیا ہو یا نہ کیا گیا ہو۔ جیسا کہ ان کا مشہور قول ہے:

"لا عذر لأحد في الجهل بمخالفة لما يرى من خلق
السموات والأرض وخلق نفسه وسائر خلق ربه، أما في
الشرائع فمعذور حتى تقوم عليه الحجة."

(ترجمہ: کسی کے لئے اپنے خالق کی پہچان نہ ہونا کوئی عذر نہیں، کیونکہ وہ آسمان وزمین کی تخلیق، اپنے آپ کی تخلیق، اور اپنے رب کی باقی مخلوقات کو دیکھتا ہے۔ البتہ شریعت کے معاملات میں وہ معذور ہے جب تک کہ اس پر حجت قائم نہ ہو۔)
یہ قول امام مروزیؒ نے اپنی کتاب "المستقى" میں امام ابو حنیفہؒ سے امام ابو یوسفؒ کے واسطے سے نقل کیا ہے۔

اسی طرح امام ابو حنیفہؒ کا دوسرا قول بھی غور و فکر اور اللہ کی معرفت کے واجب ہونے پر دلیل فراہم کرتا ہے:

"لو لم يبعث الله رسولا لوجب على الخلق معرفته
بعقولهم."

(ترجمہ: اگر اللہ نے کوئی رسول نہ بھیجا ہوتا، تو بھی مخلوقات پر یہ واجب تھا کہ وہ اپنی عقل سے اللہ کی معرفت حاصل کریں۔)

یہ اقوال اس بات کی وضاحت کرتے ہیں کہ انسان کے لیے اللہ کی وحدانیت کی پہچان اس کی عقل اور فطرت کے ذریعے ممکن ہے۔ امام ابو حنیفہؒ کی رائے کے مطابق

غور و فکر محض ایک اختیار نہیں بلکہ ایک واجب عمل ہے، اور اس کے نتیجے میں وحدانیت کو تسلیم کرنا بھی لازم ہے۔

نتیجہ: انسانی فطرت اور عقل دونوں اس حقیقت کی تصدیق کرتے ہیں کہ خدا کا وجود محض ایک تصوراتی یا فلسفیانہ خیال نہیں بلکہ ایک لازمی اور حقیقی حقیقت ہے۔ فطری شعور، جو انسان کے دل میں پیدا کیا گیا ہے، اسے زندگی کے مقصد اور خالق کی معرفت کے لیے مائل کرتا ہے۔ یہ شعور نہ صرف خدا کی موجودگی کی گواہی دیتا ہے بلکہ اسے اس کے قریب لے جانے کا ذریعہ بھی بنتا ہے۔

مشکل حالات میں خدا کی طرف رجوع انسانی دل کے اندر موجود اس نور کو جگاتا ہے، جو سکون اور تسکین کا ذریعہ بنتا ہے۔ خدا کی معرفت صرف ایک نظری علم نہیں بلکہ ایک عملی تجربہ ہے، جو انسان کے قلب کو روشنی اور روح کو اطمینان بخشتا ہے۔

یہ حقیقت ہمیں اس نتیجے تک لے جاتی ہے کہ خدا کا وجود زندگی کے تمام پہلوؤں کو معنی دیتا ہے اور یہی ایمان انسان کے دل و دماغ کو متوازن رکھ کر اسے کامیابی کے راستے پر گامزن کرتا ہے۔ فطرت، عقل اور روحانی تجربات کے امتزاج سے یہ حقیقت آشکار ہوتی ہے کہ خدا کی موجودگی نہ صرف انسانی تخلیق کا بنیادی حصہ ہے بلکہ اس کی اصل حقیقت اور بقا کا ضامن بھی ہے۔

انبیاء کی صداقت: خدا کے وجود اور پیغام کی دلیل

انبیاء کا وجود اور ان کے پیغامات ایک ایسے موضوع ہیں جو صرف مسلمانوں یا کسی مخصوص مذہب کے ماننے والوں کے لیے اہم نہیں بلکہ ہر انسان کے لیے، چاہے وہ دہریہ ہو یا کسی بھی عقیدے سے وابستہ نہ ہو، غور و فکر کا ذریعہ ہیں۔ سوال یہ ہے کہ ہم انبیاء کو ”مختبر صادق“ کیوں مانیں؟ ان کے کردار اور پیغام کو کیوں تسلیم کریں، اور

کیسے ان کی گواہی خدا کے وجود کا ایک عقلی اور منطقی ثبوت بن سکتی ہے؟ آئیے اس سوال کا جائزہ ایک جامع، منطقی، اور حقیقی زندگی کی مثالوں کے ذریعے لیتے ہیں۔

مخبر صادق کا تصور اور اس کی اہمیت

ایک ”مخبر صادق“ ایسا شخص ہوتا ہے جس کی صداقت، امانت، اور کردار پر کوئی شبہ نہ ہو۔ اس کا زندگی کا ہر پہلو شفاف ہو، اور وہ کسی ذاتی مفاد کے بغیر انسانیت کی بھلائی کے لیے کوشاں ہو۔ انبیاء کی زندگیاں ایسے ہی کردار کی عملی مثال پیش کرتی ہیں۔ فرض کریں کہ ایک شخص اپنے شہر میں اپنی دیانت داری اور سچائی کی وجہ سے مشہور ہو۔ اگر وہ کہے کہ آگے راستے میں خطرہ ہے، تو ہم اس کی بات پر یقین کرتے ہیں کیونکہ ہمیں معلوم ہے کہ وہ جھوٹ نہیں بولتا۔ اسی طرح انبیاء کی صداقت کو ان کے کردار، قربانی، اور بے غرضی سے جانچا جاسکتا ہے۔

انبیاء کا کردار: ایک ناقابل تردید دلیل

دنیا کے ہر بڑے نبی کی زندگی میں ایک مشترک پہلو یہ ہے کہ ان کے دشمنوں نے بھی ان کی صداقت اور کردار پر انگلی نہیں اٹھائی۔ مثال کے طور پر: حضرت محمد ﷺ کو ان کے دشمن بھی ”الصادق“ (سچے) اور ”الامین“ (امانت دار) کہتے تھے۔

تاریخی مثال: حضرت محمد ﷺ نے نبوت کے اعلان سے پہلے 40 سال تک مکہ کے لوگوں کے درمیان زندگی گزاری۔ ان کے کردار کی گواہی ان کے دشمن بھی دیتے تھے۔ اگر وہ جھوٹے ہوتے تو ان کے مخالفین سب سے پہلے ان کے کردار کو نشانہ بناتے، لیکن ایسا نہیں ہوا۔

خدا کے وجود کی دلیل: انبیاء کا مقصد اور پیغام

انبیاء نے ہمیشہ ایک ہی پیغام دیا: خدا کی وحدانیت اور انسانیت کی بھلائی۔ مختلف ادوار اور مختلف جگہوں پر، مختلف زبانوں میں آنے والے انبیاء نے ایک ہی بنیادی پیغام دیا۔ یہ بات بذات خود ایک منطقی دلیل ہے کہ یہ سب جھوٹ نہیں ہو سکتا۔ اگر یہ انبیاء جھوٹے ہوتے، تو ان کے پیغامات میں تضاد ہوتا۔ مختلف قوموں اور زمانوں کے انبیاء کا ایک ہی بنیادی نظریہ ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ ان کا منبع ایک ہے۔

مثال کے طور پر، حضرت نوح علیہ السلام، حضرت ابراہیم علیہ السلام، حضرت موسیٰ علیہ السلام، حضرت عیسیٰ علیہ السلام، اور حضرت محمد ﷺ، سب نے توحید کی تعلیم دی۔ اگر دنیا کے مختلف حصوں میں، بغیر کسی رابطے کے، لوگ ایک ہی سچائی کی گواہی دیں، تو یہ اس بات کی دلیل ہے کہ وہ سچائی کسی ایک ہی ذریعے سے آئی ہے۔ دہریہ یا خدا کے وجود پر شک کرنے والا یہ سوال کر سکتا ہے کہ انبیاء کی باتوں پر کیوں یقین کیا جائے؟ اس کا جواب ان کے کردار، قربانی، اور ان کے لائے ہوئے اثرات میں پوشیدہ ہے۔ فرض کریں کہ ایک ماہر ڈاکٹر کسی دوا کے بارے میں کہتا ہے کہ یہ صحت کے لیے مفید ہے۔ اس کی مہارت اور تجربے کی وجہ سے ہم اس کی بات مان لیتے ہیں۔ انبیاء اس سے بھی زیادہ قابل اعتبار ہیں کیونکہ ان کی زندگیاں انسانیت کی بھلائی کے لیے وقف رہی ہیں اور ان کا کوئی ذاتی مفاد نہیں تھا۔

انبیاء کی پیش گوئیاں اور ان کی سچائی

انبیاء نے نہ صرف موجودہ حالات کے بارے میں بات کی بلکہ آنے والے وقتوں

کے بارے میں بھی پیش گوئیاں کیں جو وقت کے ساتھ سچ ثابت ہوئیں۔ یہ ان کی صداقت کا ایک اور مضبوط ثبوت ہے۔

انبیاء نے ہمیشہ ایسی تعلیمات پیش کیں جو انسانی فطرت اور عقل سے ہم آہنگ تھیں۔ ان کا پیغام نہ تو فطرت کے خلاف تھا اور نہ ہی عقل سے متصادم۔ ان کی تعلیمات کا انسانی عقل سے مطابقت رکھنا اور انسانیت کی بھلائی کے لیے ہونا، اس کی مزید وضاحت ان شاء اللہ آگے کی جلدوں میں کی جائے گی۔

انبیاء کا وجود اور ان کے پیغامات انسانیت کے لیے خدا کی طرف سے سب سے بڑی گواہی ہیں۔ ان کی زندگیاں، کردار، قربانیاں، اور پیغامات عقل، منطق، اور انسانی فطرت کے مطابق ہیں۔ ان پر یقین کرنا صرف مذہبی ایمان کی بات نہیں، بلکہ ایک منطقی ضرورت بھی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ انبیاء کی گواہی خدا کے وجود اور اس کے پیغام کی سب سے بڑی دلیل ہے، چاہے آپ کسی بھی مذہب سے تعلق رکھتے ہوں یا کسی مذہب کو نہ مانتے ہوں۔ انبیاء کی صداقت، ان کے پیغامات کی ہم آہنگی، اور ان کے اثرات ان کی سچائی کے ناقابل تردید ثبوت ہیں۔

خدا کے وجود پر آخری بات: ایک منطقی تجویز

اللہ کے وجود کے ثبوت میں بے شمار دلائل ہیں، مگر طوالت کے خوف سے ان سب کو بیان کرنا ممکن نہیں۔ اس لیے میں یہاں ایک آخری تجویز پیش کرتا ہوں، جو دل و دماغ دونوں کو جھنجھوڑتی ہے اور ایک منطقی نقطہ نظر سے مسئلے کو حل کرتی ہے۔ یہ تجویز "پاسکل کی شرط" (Pascal's Wager) کے نام سے مشہور ہے۔

فرائیسی فلسفی بلیز پاسکل نے اس نظریے کو پیش کرتے ہوئے کہا کہ خدا پر یقین کرنا عقل اور انسانیت دونوں کے لیے سب سے بہتر راستہ ہے، چاہے ہم یقین کے بارے میں مکمل طور پر قائل نہ بھی ہوں۔

پاسکل کی شرط: خدا پر یقین کیوں ضروری ہے؟

پاسکل کہتا ہے کہ انسان کے پاس دو راستے ہیں: یا تو وہ خدا کے وجود پر یقین کرے، یا اس کا انکار کرے۔ اب سوال یہ ہے کہ دونوں میں سے کس انتخاب کے نتائج بہتر ہیں؟

اگر آپ خدا پر یقین رکھتے ہیں اور وہ واقعی موجود ہے، تو آپ ابدی نجات اور سکون کے مستحق ہوں گے۔

اگر آپ خدا پر یقین رکھتے ہیں اور وہ (نعوذ باللہ) موجود نہ بھی ہو، تو آپ نے اپنی زندگی کو اخلاقی، منظم اور انسانیت کی خدمت میں گزارا ہوگا۔

لیکن اگر آپ خدا کے وجود کا انکار کرتے ہیں اور وہ موجود ہوا، تو آپ کو ہمیشہ کے نقصان کا سامنا کرنا پڑے گا۔

اور اگر آپ انکار کرتے ہیں اور وہ موجود نہ بھی ہو، تو آپ کی زندگی بغیر کسی بلند مقصد کے گزرے گی۔

سوچنے کی بات یہ ہے کہ اگر خدا پر یقین کرنے کا نتیجہ دنیا و آخرت دونوں میں سکون، مقصد اور نجات کا ذریعہ بن سکتا ہے، تو یہ ایک ایسا راستہ کیوں نہ اپنایا جائے جو دونوں جہانوں میں کامیابی کی ضمانت دے؟

پاسکل کے نظریے کی اصل خوبصورتی یہ ہے کہ یہ انسان کو اس کی آخری منزل پر

غور و فکر کرنے کی دعوت دیتا ہے۔ یہ دل کو جھنجھوڑتا ہے اور زندگی کے حقیقی مقصد پر سوچنے پر مجبور کرتا ہے۔

ہم دیکھتے ہیں کہ آج دنیا میں بے شمار لوگ اپنے اندر ایک غلامحسوس کرتے ہیں، زندگی کی بے معنی دوڑ میں الجھ کر سکون اور خوشی سے محروم ہو جاتے ہیں۔ لیکن وہی لوگ جو خدا پر یقین رکھتے ہیں، انہیں ایک بلند مقصد، اندرونی سکون اور اخلاقی رہنمائی ملتی ہے، جو ان کی زندگی کو معنی دیتا ہے۔

اس لیے، اے انسان، اپنی فطرت، عقل اور دل کی گہرائیوں میں جھانک کر غور کرو۔ خدا پر یقین نہ صرف عقل کے لیے ایک مضبوط بنیاد ہے بلکہ دل کے سکون اور روحانی تسکین کا ذریعہ بھی ہے۔ یہی وہ یقین ہے جو زندگی کے ہر موڑ پر روشنی فراہم کرتا ہے اور آخرت میں نجات کی ضمانت دیتا ہے۔

”ایسے مان لو، جیسے تم کھودینے سے ڈرتے ہو، اور اس یقین کے ساتھ جیو، جیسے تم حاصل کرنے کے لیے زندہ ہو۔“

زندگی کا یہ سفر، اگر خدا کے یقین کے ساتھ طے کیا جائے، تو نہ صرف دنیا میں سکون بخش ہوگا بلکہ آخرت میں دائمی کامیابی کا باعث بھی بنے گا۔

خدا اور مذہب پر وارد ہونے والے چند اعتراضات

اس باب میں خدا کے وجود اور مذہب سے متعلق وہ اعتراضات زیر بحث آئیں گے جو اکثر لوگ اٹھاتے ہیں۔ ان اعتراضات کے ذریعے وہ خدا کے وجود یا مذہب کی حقانیت پر سوال اٹھاتے ہیں۔ ان جوابات کے اصول اور دلائل کو سمجھ کر دیگر کئی سوالات اور شبہات کو بھی انہی بنیادوں پر پرکھا اور حل کیا جاسکتا ہے، جو قارئین کے لیے

فکری رہنمائی کا ذریعہ بنیں گے۔ باقی اعتراضات جو قرآن کی آیات، سیرت، احادیث، فقہی عبارتوں یا دیگر موضوعات سے متعلق ہیں، ان شاء اللہ آئندہ جلدوں میں ان پر مکمل تفصیل سے گفتگو کی جائے گی۔

اعتراض نمبر 1: "اگر عدم سے کچھ بھی وجود میں نہیں آسکتا

تو خدا نے کائنات کو عدم سے کیسے پیدا کیا؟"

یہ اعتراض ان لوگوں کی طرف سے اٹھایا جاتا ہے جو خدا کے وجود اور کائنات کی تخلیق پر شکوک رکھتے ہیں۔ ان کا دعویٰ ہے کہ اگر ہم یہ مانتے ہیں کہ "عدم سے کچھ وجود میں نہیں آسکتا"، تو پھر یہ سوال: پیدا ہوتا ہے کہ خدا نے کائنات کو عدم سے کیسے تخلیق کیا؟ یہ سوال بظاہر معقول لگتا ہے، لیکن حقیقت میں یہ خدا کے وجود اور اس کی تخلیقی صفات کو صحیح طور پر نہ سمجھنے کا نتیجہ ہے۔

جواب: یہ اعتراض کئی بنیادی غلط فہمیوں پر مبنی ہے، جنہیں درج ذیل نکات کے ذریعے واضح کیا جاسکتا ہے:

❑ خدا کی ذات عدم نہیں بلکہ ازلی ہے

سب سے پہلے یہ سمجھنا ضروری ہے کہ خدا کی ذات "عدم" کے زمرے میں نہیں آتی۔ خدا ازلی اور ابدی ہے، یعنی وہ ہمیشہ سے موجود ہے اور ہمیشہ رہے گا، جس کو ہم اصطلاح میں واجب الوجود کہتے ہیں۔ جب ہم یہ کہتے ہیں کہ "عدم سے کچھ نہیں آسکتا"، تو یہ اصول خدا پر لاگو نہیں ہوتا کیونکہ خدا کا وجود خود وجود کی بنیاد اور اصل ہے۔ خدا کو "عدم" کے ساتھ جوڑنا ایک استدلالی غلطی ہے۔

خدا کا ارادہ اور قدرت تخلیق کا سبب ہیں

کائنات کی تخلیق عدم کی بنیاد پر نہیں بلکہ خدا کے ارادہ اور قدرت کی بنیاد پر ہوئی۔ خدا کی قدرت اور ارادہ وہ اسباب ہیں جنہوں نے کائنات کو وجود بخشا۔ عدم میں خود سے کچھ پیدا کرنے کی کوئی صلاحیت نہیں ہوتی، لیکن خدا کے ارادہ اور قدرت نے ناممکن کو ممکن بنایا۔

عدم اور خدا کی تخلیق کا فرق

یہ اعتراض عدم اور خدا کے تخلیقی عمل کو ایک جیسا سمجھنے کی غلطی کرتا ہے۔ عدم کا مطلب مکمل غیر موجودگی ہے، جہاں نہ کوئی امکان ہوتا ہے اور نہ کوئی حرکت۔ لیکن خدا کی ذات ہر امکان اور ہر حرکت کی بنیاد ہے۔ خدا کا تخلیقی عمل اس کی قدرت اور ارادہ سے جڑا ہوا ہے، نہ کہ کسی مادی بنیاد پر۔

خدا کی تخلیق: مواد کے بغیر، مگر ارادہ اور قدرت کے ساتھ

اسلامی تعلیمات کے مطابق، خدا نے کائنات کو کسی پہلے سے موجود مواد کے بغیر پیدا کیا، بلکہ یہ اس کے ارادہ اور قدرت کی مظہر ہے۔ کائنات کا وجود ”عدم“ سے ہوا، اور یہ خدا کے حکم کن (ہو جا) کا نتیجہ ہے، جو کسی بھی مادی وجود سے پہلے کارفرما ہوا۔ جہاں تک بگ بینک تھیوری کا تعلق ہے، وہ اس بات کی وضاحت کرتی ہے کہ کائنات کی ابتدا ایک نقطہ (Singularity) سے ہوئی، جہاں تمام مادہ، توانائی، اور وقت ایک انتہائی کثیف اور گرم حالت میں موجود تھے۔ اسلامی عقیدہ اس بات کو واضح کرتا ہے کہ بگ بینک کا سبب خدا کی قدرت اور ارادہ تھا، کیونکہ خود بگ بینک کے لیے بھی ایک محرک کی ضرورت تھی جو اسے وقوع پذیر کرے۔

خدا کا یہ ارادہ کسی مادی بنیاد پر نہیں، بلکہ اس کی لامحدود قدرت پر مبنی تھا، جو انسانی فہم سے بالاتر ہے۔ یہ کہنا کہ ”مواد کے بغیر تخلیق“ خدا کی قدرت کو ظاہر کرتا ہے کہ اس نے اس مادے اور وقت کو بھی تخلیق کیا جس سے کائنات وجود میں آئی۔ بگ بینک خدا کی تخلیق کے اس ابتدائی مرحلے کی سائنسی وضاحت ہو سکتی ہے، لیکن اس کا محرک اور آغاز خدا کی مرضی اور قدرت ہے۔

لہذا، اسلامی تعلیمات اور بگ بینک تھیوری میں تضاد نہیں، بلکہ یہ اس بات کی گواہی دیتے ہیں کہ مادے، وقت، اور کائنات کا آغاز ایک عظیم ارادے اور حکمت کا نتیجہ ہے، جس کا منبع خدا کی ذات ہے۔

❑ اعتراض کا داغی تضاد

یہ اعتراض خود تضاد کا شکار ہے۔ اگر یہ مان لیا جائے کہ ”عدم سے کچھ وجود میں نہیں آسکتا“، تو اس اصول کے مطابق، کائنات کو وجود میں لانے کے لیے کسی خالق کا ہونا لازم ہے۔ یہی خالق خدا ہے، جو خود کسی مادی سبب کا محتاج نہیں بلکہ ہر سبب کی بنیاد ہے۔

ابن رشد رحمہ اللہ نے اس بات کو یوں واضح کیا:

”بعض لوگوں نے سوال کیا کہ اللہ نے کائنات کو بغیر کسی شے کے کیسے تخلیق کیا، اور اس کا عمل کسی شے کے بغیر کیسے ممکن ہوا؟ ہم کہتے ہیں کہ فاعل کی عمل کی نوعیت یہ ہوتی ہے کہ اس کی قوت (طاقت) اس کی قدرت کے برابر ہو، اس کی قدرت اس کے ارادے کے موافق ہو، اور اس کا ارادہ اس کی حکمت کے مطابق ہو۔ یا پھر یہ ہوگا کہ اس کی قوت، قدرت سے کمزور ہو، قدرت ارادے سے کمزور ہو، اور ارادہ حکمت سے کمزور ہو۔“

”اگر ان صفات میں سے کوئی بھی دوسری سے کمزور ہو تو خالق اور مخلوق کے درمیان کوئی فرق باقی نہ رہے گا، اور خالق میں نقص کا امکان لازم آجائے گا، جو کہ عقلاً محال ہے۔ یا پھر یہ ہو گا کہ ان تمام صفات میں سے ہر ایک مکمل ترین اور اعلیٰ درجے کی ہوگی۔ لہذا، وہ جو چاہے، جیسا چاہے، بغیر کسی شے کے پیدا کر سکتا ہے۔ تعجب صرف ہم انسانوں کی کمزوریوں پر ہوتا ہے، جو ہماری سوچ کو محدود کر دیتی ہیں۔ (۱)

یعنی جب ہم نے اللہ تعالیٰ کو تمام تر قدرت، طاقت، حکمت، ارادے، اور نقائص سے پاک مان لیا، جو اسے مخلوق سے ممتاز بناتی ہے، تو یہ سوال کہ اس نے دنیا کو عدم سے کیسے پیدا کیا، بے بنیاد ہو جاتا ہے۔ کیونکہ ایسی ذات جو ہر قسم کے نقص سے پاک ہو، اپنے ارادے کو جیسا چاہے، ویسا وجود میں لا سکتی ہے۔

اگر ملحدین اس تعریف کو قبول نہیں کرتے، تو وہ خدا کے لیے اپنی کوئی تعریف پیش کریں۔ لیکن جب وہ خود دنیا کو ایک حادثاتی امر مانتے ہیں اور اس حادثے کی وجہ جاننے میں ناکام ہیں، تو خدا کے وجود تک ان کی رسائی ممکن نہیں۔ اس لیے ان پر لازم ہے کہ وہ ہماری پیش کردہ تعریف کو قبول کریں، جو مشہور لغات میں بھی موجود ہے۔ جب خدا کی یہ تعریف مان لی جائے، تو پھر یہ سوال کہ اس نے کائنات کو عدم سے کیسے پیدا کیا، خود غیر معقول بن جاتا ہے۔

نتیجہ: یہ اعتراف درحقیقت خدا کے وجود اور اس کی صفات کو نہ سمجھنے کا نتیجہ ہے۔ خدا عدم سے کائنات کو پیدا کرنے والا نہیں، بلکہ وہ اپنی قدرت اور ارادہ سے کائنات کا خالق ہے۔ خدا کی ذات عدم کی قید سے آزاد ہے اور ہر قسم کے امکان اور وجود کی بنیاد ہے۔ لہذا، یہ اعتراف منطقی اور عقلی بنیادوں پر خود ہی اپنی تردید کرتا ہے۔

اعتراض نمبر 2: کیا کائنات خود سے وجود میں آ سکتی ہے؟

یہ سوال: اکثر اٹھایا جاتا ہے: کیا کائنات خود اپنے آپ وجود میں آ سکتی ہے؟ اصطلاح ”تخلیق“ واضح کرتی ہے کہ تخلیق شدہ چیز کسی نہ کسی وقت وجود میں نہیں تھی، اور پھر کسی عمل کے ذریعے وجود میں لائی گئی۔ یہ تصور کہ کوئی چیز خود اپنے آپ کو تخلیق کر سکتی ہے، منطقی اور عملی طور پر ناقابل قبول ہے۔

جواب: یہ اعتراض کئی پہلوؤں سے غلط ثابت ہوتا ہے، جنہیں درج ذیل نکات کے ذریعے واضح کیا جاسکتا ہے:

❑ خود تخلیق کا تصور ایک منطقی تضاد ہے

جب ہم تخلیق کے مفہوم کو سمجھتے ہیں تو یہ ظاہر ہوتا ہے کہ تخلیق کسی چیز کے عدم سے وجود میں آنے کو ظاہر کرتی ہے۔ خود سے تخلیق کا دعویٰ اس امر پر اصرار کرتا ہے کہ کوئی چیز اپنے وجود میں آنے سے پہلے موجود تھی۔

یہ دعویٰ منطقی طور پر ناممکن ہے۔ مثال کے طور پر:

ایک عمارت جو تعمیر سے پہلے وجود نہیں رکھتی، کیسے اپنی تعمیر کے لیے خود کوئی عمل کر سکتی ہے؟ یہ ایسا ہی ہے جیسے کوئی کہے کہ ایک کتاب نے خود کو لکھایا یا ایک گاڑی نے خود کو بنایا۔ یہ سب دعوے واضح طور پر غیر معقول ہیں۔

❑ کائنات کا خود سے تخلیق ہونا ایک مغالطہ ہے

اگر ہم یہ دعویٰ کریں کہ کائنات خود اپنے آپ کو تخلیق کر سکتی ہے، تو اس کا مطلب ہوگا کہ وہ اپنے وجود میں آنے سے پہلے موجود تھی تاکہ اپنے آپ کو تخلیق کر سکے۔ یہ

ایک کھلا تضاد ہے جو کسی طور قابل قبول نہیں۔

امام خطابی رحمہ اللہ اس بارے میں فرماتے ہیں:

”یہ دلیل ایک اور بھی بڑی مغالطہ انگیز دلیل ہے۔“ (۱)

کچھ افراد یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ کائنات ہمیشہ سے موجود تھی اور اسے کسی تخلیق کی ضرورت نہیں۔ لیکن جدید سائنسی تحقیق، جیسے بگ بینک تھیوری، واضح کرتی ہے کہ کائنات کا ایک آغاز تھا۔

بگ بینک تھیوری کے مطابق، کائنات ایک ”سنگولیئرٹی“ سے وجود میں آئی۔ یہ ”آغاز“ اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ کائنات کے وجود کے لیے کسی خارجی علت (External Cause) کی ضرورت تھی۔ یہ علت ایسی ہونی چاہیے جو خود مخلوق نہ ہو، کیونکہ کوئی بھی چیز اپنے وجود کے لیے خود پر انحصار نہیں کر سکتی۔

❑ کائنات کی تخلیق کا فلسفیانہ پہلو

فلسفیانہ طور پر، اگر ہم یہ تسلیم کر لیں کہ کائنات نے خود کو تخلیق کیا، تو یہ تسلیم کرنا ہوگا کہ کائنات نے اپنے وجود سے پہلے اپنے اوپر عمل کیا، جو کہ ناممکن ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوگا کہ کائنات ایک ہی وقت میں موجود بھی تھی اور غیر موجود بھی، جو کہ کسی بھی عقلی اصول کے خلاف ہے۔

نتیجہ: یہ بات منطقی، سائنسی، اور فلسفیانہ طور پر ثابت ہو چکی ہے کہ کائنات کا خود سے وجود میں آنا ناممکن ہے۔ اس کے وجود کے لیے ایک ایسی علت کی ضرورت ہے جو خود غیر مخلوق ہو، ازلی ہو، اور ہر چیز کو تخلیق کرنے کی قدرت رکھتی ہو۔

یہی علت ”اللہ تعالیٰ“ کی ذات ہے، جو کائنات کے وجود اور اس کے نظام کی بنیاد ہے۔ اللہ کی ذات ہی وہ واحد حقیقت ہے جو ہر سبب سے ماورا ہے اور ہر تخلیق کا آغاز اور اختتام ہے۔

اعتراض نمبر 3: کیا کائنات کو کسی اور کائنات نے تخلیق کیا؟

بعض لوگ یہ دلیل پیش کرتے ہیں کہ شاید ہماری کائنات کو کسی دوسری کائنات نے تخلیق کیا ہو۔ یہ تصور بظاہر تخلیق کے مسئلے کا جواب فراہم کرتا ہے، لیکن حقیقت میں یہ ایک اور پیچیدہ مسئلہ پیدا کرتا ہے۔ یہ دلیل ”لامتناہی سلسلہ“ (Infinite Regression) کے مسئلے میں الجھ جاتی ہے، جو منطقی اور فلسفیانہ طور پر غیر معقول ہے۔

لامتناہی سلسلے کا مسئلہ

اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ ہماری کائنات کو کسی دوسری کائنات نے تخلیق کیا، تو پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ دوسری کائنات کہاں سے آئی؟ اور اگر وہ بھی کسی تیسری کائنات کے ذریعے وجود میں آئی، تو یہ سلسلہ کبھی ختم نہیں ہوگا۔ یہ لامتناہی سلسلہ اس بات کو ناممکن بنا دیتا ہے کہ تخلیق کے اصل سبب تک پہنچا جائے۔ لامتناہی سلسلہ فلسفہ اور منطق دونوں میں ایک ناقابل قبول تصور ہے، کیونکہ یہ کسی بھی مسئلے کا حتمی جواب فراہم نہیں کرتا۔

سائنسی نقطہ نظر

کچھ سائنس دان ”Multiverse“ (متعدد کائناتوں) کے نظریے کو پیش کرتے ہیں، جس کے مطابق ہماری کائنات ایک ”مادر کائنات“ یا کسی بڑی حقیقت کا حصہ ہو سکتی ہے۔ لیکن یہ نظریہ بھی کسی منطقی یا سائنسی بنیاد پر تخلیق کے مسئلے کا حتمی جواب نہیں

دیتا۔ یہ تصور صرف سوال کو ایک قدم پیچھے لے جاتا ہے، لیکن اس کا حل فراہم نہیں کرتا۔
 بگ بینک جیسے نظریات واضح طور پر یہ ثابت کرتے ہیں کہ کائنات کا ایک آغاز تھا۔ اس آغاز کا سبب کوئی خارجی علت (External Cause) ہی ہو سکتی ہے، جو خود کسی علت کی محتاج نہ ہو۔

اس تصور کو یوں سمجھیں:

فرض کریں کہ آپ کسی کتاب کو حاصل کرنا چاہتے ہیں، لیکن وہ کتاب ایک لامتناہی قطار کے آخر میں رکھی ہوئی ہے، اور ہر کتاب اپنی جگہ کسی اور کتاب کی اجازت پر منحصر ہے۔ ایسی صورت میں آپ کبھی بھی اپنی مطلوبہ کتاب تک نہیں پہنچ سکتے۔ اسی طرح، اگر کائناتوں کا سلسلہ لامتناہی ہو، تو تخلیق کا حتمی سبب کبھی سامنے نہیں آسکتا۔

نتیجہ: یہ دعویٰ کہ ہماری کائنات کو کسی دوسری کائنات نے تخلیق کیا، منطقی اور سائنسی طور پر مسئلے کا حل نہیں دیتا۔ یہ تصور صرف سوال کو مزید پیچیدہ بناتا ہے اور تخلیق کے اصل سبب کو نظر انداز کرتا ہے۔ حتمی طور پر، کائنات کی تخلیق ایک ازلی اور غیر مخلوق خالق ہی کی محتاج ہے، جو ہر چیز کا حقیقی سبب ہے۔

اعتراض نمبر 4: ”گاڈ آف دی گپس“

(God of the Gaps) کا جواب

اعتراض کی وضاحت:

”گاڈ آف دی گپس“ ایک مشہور حیلہ ہے جو ملحدین اکثر پیش کرتے ہیں۔ اس کے مطابق، خدا کا تصور صرف اس وقت پیش کیا جاتا ہے جب ہم کسی فطری یا سائنسی مظہر

کی وضاحت کرنے میں ناکام رہتے ہیں۔ جیسے جیسے سائنس ان مظاہر کی وضاحت کرتی ہے، خدا کی "ضرورت" ختم ہو جاتی ہے۔

مثال کے طور پر، قدیم لوگ بجلی، طوفان یا زلزلے کو خدا کی مداخلت سمجھتے تھے، لیکن آج سائنس نے ان مظاہر کی سائنسی وجوہات بیان کر دی ہیں۔ اس بنا پر اعتراض کرنے والے دعویٰ کرتے ہیں کہ خدا کا تصور صرف ایک عارضی وضاحت ہے، جو علم کے بڑھنے کے ساتھ ختم ہو جائے گا۔

جواب: 1. خدا کا تصور خلا پر کرنے کے لیے نہیں:

سب سے پہلی بات یہ ہے کہ خدا کے وجود کا عقیدہ "خلا پر کرنے" پر مبنی نہیں ہے۔ خدا کا تصور انسان کی فطری سوچ، منطق، اور فلسفہ پر مبنی ہے۔ خدا کائنات کی بنیادی حقیقتوں کا جواب دیتا ہے جیسے:

کائنات کا آغاز کیسے ہوا؟

قوانین فطرت کہاں سے آئے؟

زندگی اور شعور کا ماخذ کیا ہے؟

یہ سوالات سائنس کے دائرے سے باہر ہیں۔ سائنس صرف یہ بتا سکتی ہے کہ "چیزیں کیسے کام کرتی ہیں"، لیکن یہ کبھی نہیں بتا سکتی کہ "یہ چیزیں کیوں وجود رکھتی ہیں"۔ خدا کا تصور ان ہی "کیوں" کے سوالات کا جواب فراہم کرتا ہے۔

2. سائنس کی حدود اور خدا کا تصور:

سائنس کا میدان مادی دنیا اور مشاہداتی حقیقت تک محدود ہے۔ سائنس ان مظاہر کا مطالعہ کرتی ہے جو مشاہدے اور تجربے میں آسکیں۔ لیکن سائنس کبھی بھی کسی مستقل اور غیر مادی حقیقت (جیسے خدا) کا انکشاف نہیں کر سکتی، کیونکہ یہ اس کے دائرہ

کار سے باہر ہے۔

سائنس انحصار پذیر اشیاء کی وضاحت کرتی ہے:

سائنس ان چیزوں کی وضاحت کر سکتی ہے جو کسی اور پر انحصار کرتی ہیں، جیسے قوانین فطرت، مادہ، اور توانائی۔ لیکن یہ کبھی یہ وضاحت نہیں دے سکتی کہ وہ خود قوانین اور کائنات کیوں وجود رکھتے ہیں۔

خدا کا تصور ماورائے طبعی ہے:

خدا ایک مستقل اور ازلی حقیقت ہے، جو سائنس کے دائرے سے بالاتر ہے۔ سائنس "مشاہداتی مظاہر" کو دیکھتی ہے، لیکن خدا کا تصور "ماورائے طبعیات" (Metaphysics) سے متعلق ہے، جو سائنسی طریقہ کار کا موضوع نہیں۔

اگر ہم صرف سائنسی وضاحتوں پر اکتفا کریں اور کسی خالق کو نہ مانیں، تو ہمیں ہر مظہر کے لیے ایک نئی وضاحت تلاش کرنی ہوگی۔ یہ سلسلہ کبھی ختم نہیں ہوگا، اور ہمیں ہر سوال کے جواب کے لیے ایک اور سوال اٹھانا پڑے گا۔

مثال کے طور پر: اگر قوانین فطرت کی وضاحت کسی اور قوانین سے کی جائے، تو وہ قوانین خود کس نے بنائے؟ اس طرح ہم ایک لامتناہی سلسلے میں پھنس جائیں گے، جو منطقی طور پر ناقابل قبول ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمیں ایک ایسی مستقل حقیقت کی ضرورت ہے جو خود کسی وضاحت کی محتاج نہ ہو۔

3. خدا کا تصور فلسفیانہ اور وجودی ہے:

خدا کے وجود کا عقیدہ سائنسی نہیں بلکہ فلسفیانہ اور وجودی بنیادوں پر قائم ہے۔ کچھ اہم سوالات جو سائنس کبھی حل نہیں کر سکتی:

کائنات کیوں وجود رکھتی ہے؟

انسان کا مقصد حیات کیا ہے؟

اخلاقیات اور اچھائی و برائی کا ماخذ کیا ہے؟

یہ سوالات سائنسی نہیں بلکہ فلسفیانہ ہیں۔ سائنس ان کا جواب نہیں دے سکتی، کیونکہ

یہ ”کیوں“ (Why) کے سوالات ہیں، نہ کہ ”کیسے“ (How) کے۔

فرض کریں آپ کسی عظیم الشان محل کو دیکھتے ہیں۔ سائنس یہ بتا سکتی ہے کہ محل کس

مواد سے بنا ہے، اس کی ساخت کیسی ہے، اور اسے تعمیر کرنے کے لیے کون سی ٹیکنالوجی

استعمال ہوئی۔ لیکن یہ سوال کہ ”یہ محل کس نے بنایا اور کیوں بنایا؟“ سائنس کبھی جواب

نہیں دے سکتی۔ یہ سوال خالق کی موجودگی اور اس کے ارادے کا تقاضا کرتا ہے۔

4. خدا اور سائنس ساتھ ساتھ:

خدا اور سائنس میں کوئی تضاد نہیں۔ سائنس خدا کی تخلیق کے مظاہر کو سمجھنے کا ذریعہ

ہے، نہ کہ اس کا متبادل۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

”أَفَلَا يَنْظُرُونَ إِلَى الْإِبِلِ كَيْفَ خُلِقَتْ - (۱)“

(کیا وہ اونٹ کو نہیں دیکھتے کہ وہ کیسے پیدا کیا گیا؟)

یہ آیت واضح کرتی ہے کہ اسلام سائنس اور مشاہدے کی حوصلہ افزائی کرتا ہے تاکہ

کائنات کے خالق کو پہچانا جاسکے۔

نتیجہ: ”گاڈ آف دی گپس“ کا اعتراض خدا کے تصور کو مکمل طور پر غلط سمجھنے پر

مبنی ہے۔ خدا کا وجود کسی خلا کو پُر کرنے کے لیے نہیں بلکہ کائنات اور اس کے قوانین کی

اصل وضاحت کے لیے ضروری ہے۔ سائنس اور خدا کے تصور میں کوئی تضاد نہیں، بلکہ

دونوں ایک دوسرے کو مکمل کرتے ہیں۔ سائنس قوانین فطرت کو بیان کرتی ہے، اور خدا ان قوانین کا خالق ہے۔

اعتراض نمبر 5: اگر ہم مان لیں کہ خدا موجود ہے، تو یہ کیسے مانا

جائے کہ صرف ایک ہی خدا ہے؟ کیوں نہ دو، تین یا کئی خدا ہوں؟

یہ اعتراض وحدانیت خدا کے تصور کو سمجھنے کے لیے ایک سنہری موقع فراہم کرتا ہے۔ کیا واقعی ممکن ہے کہ دو یا زیادہ خدا کائنات کا انتظام سنبھال سکیں؟ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ اس کا جواب دیتے ہوئے فرماتے ہیں:

"لَوْ كَانَ فِيهِمَا آلِهَةٌ إِلَّا اللَّهُ لَفَسَدَتَا" (۱)

ترجمہ: اگر آسمان اور زمین میں اللہ کے سوا اور معبود ہوتے تو یہ دونوں تباہ ہو جاتے۔

حضرت علامہ شبیر احمد عثمانی **رحمۃ اللہ علیہ** اس آیت کی بہترین تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"عبادت نام ہے کامل تذلل کا، اور کامل تذلل صرف اسی ذات کے سامنے اختیار کیا جاسکتا ہے جو اپنی صفات میں ہر طرح کامل ہو۔ اسی کو ہم اللہ یا خدا کہتے ہیں۔ ضروری ہے کہ خدا کی ذات ہر قسم کے عیوب و نقائص سے پاک ہو: نہ وہ کسی حیثیت سے ناقص ہو، نہ بیکار، نہ عاجز، نہ مغلوب ہو، نہ کسی دوسرے سے دبے، نہ کوئی اس کے کام میں روک ٹوک کر سکے۔"

"اب اگر فرض کیجئے کہ آسمان وزمین میں دو خدا ہوں۔ اگر دونوں خداؤں میں

کلی اتفاق ہو، تو دو احتمال ہیں:

اگر اکیلے ایک خدا سے کام نہیں چل سکتا تھا، اس لیے دونوں نے مل کر انتظام کیا، تو یہ معلوم ہوا کہ دونوں میں سے ایک بھی کامل قدرت والا نہیں۔
اگر تنہا ایک خدا سارے عالم کا کام کامل طور پر انجام دے سکتا تھا، تو دوسرا بیکار ٹھہرا۔

اگر اختلاف کی صورت ہو، تو لا محالہ یہ ہوگا کہ ایک خدا مغلوب ہو کر اپنے ارادے اور تجویز کو چھوڑ بیٹھے گا، تو وہ خدا نہ رہا۔ اگر دونوں مساوی اور متوازی طاقت کے ساتھ اپنے اپنے ارادے کو نافذ کرنے کی کوشش کریں گے، تو خداؤں کی اس رسہ کشی میں کائنات سرے سے موجود ہی نہ ہو سکے گی، یا موجود کائنات پر زور آزمائی ہونے لگے گی، اور یہ کش مکش کائنات کو تباہ کر کے ختم کر دے گی۔ (۱)

اسی طرح تفسیر جلالین میں اس کو یوں بیان کیا گیا ہے:

”آسمان اور زمین کا نظام بگڑ جاتا کیونکہ لا محالہ داخلی اختلاف پیدا ہو جاتا، جیسا کہ عام طور پر ہوتا ہے جب کئی حاکم ہوں تو وہ ایک دوسرے کی مخالفت کرتے ہیں اور کسی بات پر متفق نہیں ہوتے۔“

❑ کشی کے کپتان کی مثال:

فرض کریں ایک کشی میں دو کپتان ہوں اور دونوں اپنے اپنے راستے کا انتخاب کریں۔ ایک چاہے مشرق کی طرف جائے اور دوسرا مغرب کی طرف، تو کشی نہ صرف اپنی منزل تک پہنچنے میں ناکام ہوگی بلکہ غرق ہو جائے گی۔

|| ٹریفک کے سگنل کی مثال:

اگر کسی چوراہے پر دو ٹریفک افسران اپنی اپنی مرضی کے اشارے دے رہے ہوں، تو اس سے افراتفری پیدا ہوگی اور حادثات یقینی ہیں۔

کائنات کا موجودہ نظم و ضبط اور ہم آہنگی، جیسے کہ سورج، چاند، ستارے اور سیارے اپنے مقررہ راستوں پر چل رہے ہیں، یہ اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ یہ سب ایک ہی ذات کے حکم کے تابع ہیں۔ اگر خدا خواستہ ایک سے زیادہ خدا ہوتے تو ہر خدا اپنی مرضی سے کائنات کے قوانین میں دخل دیتا، جس کے نتیجے میں یہ نظام درہم برہم ہو جاتا۔

نتیجہ: کائنات کے منظم اور متوازن نظام کا مشاہدہ اس بات کا سب سے بڑا ثبوت ہے کہ اس کا خالق ایک ہی ہے۔ وحدانیت کا یہ تصور نہ صرف عقلی اور منطقی بنیادوں پر درست ہے بلکہ کائنات کے ہر مظہر میں اس کی گواہی موجود ہے۔ اگر ایک سے زیادہ خدا ہوتے تو کائنات کبھی بھی اس ہم آہنگی کے ساتھ وجود نہیں رکھ سکتی تھی جو ہم روز دیکھتے ہیں۔

اعتراض نمبر 6: اگر خدا موجود ہے اور وہ مہربان اور رحم کرنے والا

ہے، تو دنیا میں اتنی برائیاں، مصیبتیں، اور دکھ کیوں ہیں؟

یہ اعتراض عام طور پر دنیا میں موجود دکھ، نا انصافی اور برائی کو دیکھ کر کیا جاتا ہے۔ یہ سوال انسانی جذبات سے جڑا ہوا ہے۔ انسانوں اور دیگر جانداروں کے ساتھ ہمدردی اور فکر کی بنا پر بھی ملحدین یہ دلیل دیتے ہیں کہ ایک طاقتور اور رحیم خدا کا وجود دنیا میں پائی جانے والی برائی اور مصیبت کے ساتھ مطابقت نہیں رکھتا۔ اگر خدا رحیم ہے تو وہ چاہے گا کہ برائی اور دکھ ختم ہو جائیں، اور اگر وہ قادرِ مطلق ہے تو اسے انہیں ختم کرنے کی

طاقت ہونی چاہیے۔ لیکن چونکہ دنیا میں برائی اور مصیبت موجود ہیں، اس کا مطلب یہ ہے کہ یا تو خدا قادرِ مطلق نہیں، یا وہ رحمت سے خالی ہے، یا پھر دونوں باتیں درست ہیں۔

جواب: دنیا میں برائی اور مصیبتوں کے وجود کے حوالے سے پیش کیا جانے والا اعتراض کمزور ہے کیونکہ یہ خدا کی صفات کے بارے میں ایک غلط مفروضے پر مبنی ہے۔ اس میں یہ تصور کیا جاتا ہے کہ خدا صرف رحیم اور قادرِ مطلق ہے، جبکہ قرآن مجید نے خدا کی دیگر کئی صفات کو بھی بیان کیا ہے، جنہیں نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ خدا حکیم بھی ہے، یعنی ہر کام حکمت کے تحت انجام دیتا ہے، اور عدل بھی ہے، جو ہر چیز کو انصاف کے ساتھ اس کے مقام پر رکھتا ہے۔ برائی اور مصیبتوں کا وجود خدا کی حکمت اور عدل سے جڑا ہوا ہے، جو انسان کی آزمائش اور دنیاوی زندگی کے عارضی ہونے کو واضح کرتا ہے۔ اس لیے خدا کی مکمل صفات کو سمجھے بغیر اس پر اعتراض کرنا حقیقت سے دور ہے۔

یہ اعتراض، جو دنیا میں برائی اور دکھ کے وجود کو خدا کے رحم اور قدرت کے خلاف پیش کرتا ہے، دراصل "ایگو سینٹرزم" یعنی خود مرکزیت کے تعصب پر مبنی ہے۔ یہ نقطہ نظر اس بات پر اصرار کرتا ہے کہ اگر ایک شخص کسی مسئلے کی کوئی معقول وجہ نہیں سمجھ سکتا تو وہ فرض کر لیتا ہے کہ کسی اور کے پاس بھی اس مسئلے کا کوئی معقول جواز نہیں ہوگا، حتیٰ کہ خدا کے پاس بھی نہیں۔ اس تعصب کی وجہ سے کچھ دہریے یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ اگر دنیا میں برائی اور مصیبت موجود ہے، تو اس کا مطلب یہ ہے کہ خدا ان کے وجود کو درست ثابت کرنے میں ناکام ہے۔ اگر خدا کے پاس ان مظاہر کا کوئی جواز نہیں، تو خدا کی رحمت اور قدرت محض ایک دھوکہ ہیں، اور اس طرح خدا کا تصور باطل ہو جاتا ہے۔

یہ اعتراض دراصل انسانی فہم کو خدا کے علم اور حکمت پر مسلط کرنے کی ایک کوشش ہے۔ دہریے یہ تصور کرتے ہیں کہ خدا کو بھی انسانوں کی طرح سوچنا چاہیے

اور وہ اسی انسانی منطق کے دائرے میں محدود ہے، جو انسان خود سمجھ سکتا ہے۔ یہ ایک غیر معقول دلیل ہے، کیونکہ خدا کی ذات انسانی فہم اور علم سے بالاتر ہے۔ خدا کی حکمت اور علم لامحدود ہیں، اور وہ تمام حقیقتوں کا احاطہ کرتا ہے، جبکہ انسان کا علم محدود اور ناقص ہے۔

یہ کہنا کہ اگر انسان دنیا میں برائی اور دکھ کی حکمت نہیں سمجھ سکتا، تو خدا بھی نہیں سمجھ سکتا، دراصل خدا کو انسانی سطح پر محدود کرنے کے مترادف ہے۔ خدا کا تصور مخلوقات کی حدود سے بالاتر ہے، اور وہ اپنی حکمت کے مطابق ہر چیز کو تخلیق کرتا اور سنبھالتا ہے۔

دنیا کی حقیقت: آزمائش کا میدان

دنیا کو ہمیشہ ایک عارضی اور امتحانی جگہ کے طور پر دیکھا گیا ہے۔ قرآن مجید واضح طور پر بیان کرتا ہے کہ یہ دنیا انسان کے لیے آزمائش کا مقام ہے:

"وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْأَمْوَالِ وَالْأَنْفُسِ وَالثَّمَرَاتِ وَبَشِّرِ الصَّابِرِينَ" (۱)

(ترجمہ: اور ہم تمہیں خوف، بھوک، مال، جانوں اور پھلوں کی کمی سے ضرور آزمائیں گے، اور صبر کرنے والوں کو خوشخبری دے دو۔)

دنیا کو آخرت کے نظام جزا و سزا کے تناظر میں سمجھنا ہوگا۔ اگر ہر چیز دنیا میں مکمل طور پر منصفانہ ہو، تو پھر آخرت کی کوئی ضرورت باقی نہیں رہتی۔

انسانی اختیار اور آزادی

اللہ تعالیٰ نے انسان کو ارادہ اور اختیار کی آزادی دی ہے تاکہ وہ اپنے اعمال

کے لیے ذمہ دار ہو۔ برائی کا زیادہ تر حصہ اسی انسانی آزادی کا نتیجہ ہے:

مثال: اگر ایک شخص ظلم کرتا ہے یا دھوکہ دیتا ہے، تو یہ اس کے اپنے اختیار کا غلط استعمال ہے۔ اللہ نے اسے برائی کرنے پر مجبور نہیں کیا، بلکہ اچھائی اور برائی کے راستے دکھادیے ہیں:

"وَهَدَيْنَاهُ النَّجْدَيْنِ" (۱)

ترجمہ: اور ہم نے اسے دو راستے دکھادیے۔

اگر برائی کو ختم کر دیا جائے یا انسان کو مکمل طور پر مجبور کر دیا جائے تو یہ انسانی آزادی اور آزمائش کے نظام کو بے معنی بنا دے گا۔

مصیبتوں میں حکمت

اللہ تعالیٰ کی حکمت انسان کی محدود عقل سے ماورا ہے۔ مشکلات اور مصیبتیں درحقیقت انسان کی روحانی ترقی، عاجزی، اور اللہ سے قربت کے لیے ایک ذریعہ ہیں:

"عَسَىٰ أَنْ تَكْرَهُوا شَيْئًا وَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ وَعَسَىٰ أَنْ تُحِبُّوا شَيْئًا وَهُوَ شَرٌّ لَّكُمْ وَاللَّهُ يَعْلَمُ وَأَنْتُمْ لَا تَعْلَمُونَ" (۲)

(ترجمہ: ہو سکتا ہے کہ تم کسی چیز کو ناپسند کرو اور وہ تمہارے لیے بہتر ہو، اور ہو سکتا ہے کہ تم کسی چیز کو پسند کرو اور وہ تمہارے لیے نقصان دہ ہو۔ اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔)

جیسے ایک ماں اپنے بچے کو انجکشن لگواتی ہے، جو بچے کے لیے تکلیف دہ ہوتا ہے، لیکن ماں جانتی ہے کہ یہ اس کی صحت کے لیے ضروری ہے۔

(۱) سورة البلد: 10-

(۲) سورة البقرة: 216-

برائی اور اچھائی کی پہچان

دنیا میں برائی کا وجود درحقیقت اچھائی کی پہچان کے لیے ضروری ہے۔ اگر صرف خوشی اور سکون ہوتا تو انسان کبھی اس کی قدر نہ کرتا۔

مثال: روشنی کی اہمیت ہمیں اندھیرے سے سمجھ آتی ہے۔

اسی طرح، خوشی کی حقیقی قدر وہی جان سکتا ہے جس نے کبھی دکھ کا سامنا کیا ہو۔ دنیا میں ظالم کو سزا نہ ملنا یا مظلوم کی مدد نہ ہونا بظاہر نا انصافی معلوم ہوتا ہے، لیکن قرآن مجید میں واضح کیا گیا ہے کہ آخرت میں ہر عمل کا پورا حساب ہوگا:

"فَمَنْ يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَرَهُ ﴿٢٤﴾ وَمَنْ يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَرَهُ" (۱)

(ترجمہ: پس جس نے ذرہ برابر بھی نیکی کی ہوگی، وہ اسے دیکھ لے گا۔ اور جس نے ذرہ برابر بھی برائی کی ہوگی، وہ بھی اسے دیکھ لے گا۔)

جذباتی نقطہ نظر: خدا سے دوری یا قرب؟

مصیبتیں انسان کے لیے امتحان کا ذریعہ ہیں۔ ان کے ذریعے انسان یا تو خدا سے دور ہو جاتا ہے یا خدا کے قریب آ جاتا ہے۔ جیسے زمین کو زرخیز بنانے کے لیے ہل چلایا جاتا ہے، جو زمین کے لیے تکلیف دہ عمل لگتا ہے، لیکن اس کے نتیجے میں بہترین فصل اگتی ہے۔ اسی طرح، مشکلات انسان کو صبر، استقامت، اور خدا سے رجوع کرنے کا موقع فراہم کرتی ہیں۔

نتیجہ: دنیا میں موجود برائی، دکھ اور مصیبتیں انسان کے لیے آزمائش،

تربیت، اور روحانی ترقی کا ذریعہ ہیں۔ یہ اللہ کی حکمت کا حصہ ہیں، جسے ہم اپنی محدود عقل سے مکمل طور پر سمجھ نہیں سکتے۔ اگر ہم دنیا کی حقیقت، انسانی آزادی، اور آخرت کے تصور کو سمجھیں تو یہ اعتراض خود ہی بے معنی ہو جاتا ہے۔ ان مشکلات کا مقصد انسان کو اللہ کے قریب کرنا اور اسے اس کی اصل حقیقت کا احساس دلانا ہے۔

اعتراض نمبر 7: اگر خدا اچھا ہے تو وہ برائی کیوں پیدا کرتا ہے؟

کیا برائی کا خالق خود بھی برا نہیں؟

اس اعتراض میں یہ مفروضہ شامل ہے کہ اگر خدا نے برائی پیدا کی ہے تو وہ خود برا ہوگا۔ یہ سوال بظاہر منطقی لگتا ہے، لیکن اس میں کئی فلسفیانہ غلط فہمیاں موجود ہیں۔

1. برائی کی حقیقت: کیا برائی حقیقی وجود رکھتی ہے؟

سب سے پہلے یہ سمجھنا ضروری ہے کہ برائی (Evil) بذات خود کوئی حقیقی وجود رکھتی ہے یا یہ کسی چیز کی کمی کو ظاہر کرتی ہے؟ برائی کو روشنی اور اندھیرے کی مثال سے سمجھا جا سکتا ہے:

روشنی ایک حقیقی وجود ہے، جبکہ اندھیرا روشنی کی غیر موجودگی کا نام ہے۔

اسی طرح گرمی ایک حقیقی چیز ہے، لیکن سردی محض گرمی کی کمی کو کہتے ہیں۔

اسی طرح، برائی بذات خود کوئی مخلوق نہیں بلکہ اچھائی کی غیر موجودگی ہے۔ اگر

کہیں عدل نہ ہو تو وہاں ظلم پیدا ہوتا ہے، اور اگر رحم نہ ہو تو قساوت وجود میں آتی ہے۔ یہ

کہنا کہ خدا نے برائی تخلیق کی، دراصل برائی کے فلسفے کو نہ سمجھنے کا نتیجہ ہے۔

2. خدا نے کیا تخلیق کیا؟

خدا نے جو کچھ تخلیق کیا، وہ بذات خود اچھائی اور خیر پر مبنی ہے۔ قرآن میں اللہ تعالیٰ

فرماتا ہے:

"الَّذِي أَحْسَنَ كُلَّ شَيْءٍ خَلَقَهُ" (۱)

(ترجمہ: جس نے ہر چیز کو خوبصورت اور بہترین بنایا۔)

چودھویں صدی کے عالم امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے اس نکتہ کو خوب وضاحت کے ساتھ بیان کیا ہے:

اللہ تعالیٰ خالص برائی کو پیدا نہیں کرتا۔ بلکہ جو کچھ وہ پیدا کرتا ہے، اس میں حکمت ہوتی ہے جو بھلائی پر مبنی ہوتی ہے۔ البتہ، اس میں کچھ لوگوں کے لیے برائی ہو سکتی ہے، اور یہ جزوی اور نسبتی برائی ہے۔ جہاں تک مکمل یا مطلق برائی کا تعلق ہے، تو اللہ تعالیٰ اس سے پاک اور بری ہے۔ (۲)

ہنری لاؤسٹ اپنی تصنیف *Essay sur les doctrines sociales*

et politiques de Taki-d-Din Ahmad b. Taimiya میں اس

نکتہ کی وضاحت کرتے ہیں:

"خدا کی ذات بنیادی طور پر سرپرست اور نگہبان ہے۔ برائی کا حقیقی وجود دنیا میں نہیں پایا جاتا۔ جو کچھ بھی خدا نے چاہا ہے وہ صرف اعلیٰ انصاف اور لامحدود بھلائی کے مطابق ہو سکتا ہے، بشرطیکہ اسے مجموعی نقطہ نظر سے دیکھا جائے اور ان جزوی اور ناقص علم کے نقطہ نظر سے نہ دیکھا جائے جو اس کی مخلوقات کو حقیقت کے بارے میں حاصل ہے۔ (۳)

(۱) سورة السجدة: 7-

(۲) مجموع الفتاوی، جلد 14، صفحہ 266-

(3) Hoover, J. (2007) Ibn Taymiyya's Theodicy of Perpetual Optimism. Leiden: Brill. P. 4

خدا نے انسان کے لیے اچھائی اور برائی دونوں راستے واضح کر دیے ہیں اور اسے آزادی دی ہے کہ وہ اپنی مرضی سے کسی ایک کا انتخاب کرے۔ اگر کوئی شخص اچھائی کے راستے کو ترک کرتا ہے تو اس کے نتیجے میں برائی کا وجود ناگزیر ہے۔ برائی کا وجود دراصل اس بات کا ثبوت ہے کہ انسان کو اپنی زندگی میں انتخاب کی آزادی عطا کی گئی ہے، تاکہ وہ اپنی مرضی اور ارادے سے اچھائی یا برائی کا راستہ چن سکے۔

3. برائی کا وجود اور انسانی آزمائش

برائی کا وجود انسان کے لیے ایک آزمائش کا ذریعہ ہے۔ اگر دنیا میں صرف اچھائی ہی ہوتی، تو اچھائی کا کوئی معنی نہ ہوتا۔ برائی کے وجود سے اچھائی کی اہمیت اور پہچان ہوتی ہے۔

اگر امتحان میں صرف صحیح جوابات ہوں اور کوئی غلط جواب نہ ہو تو امتحان کی کوئی حیثیت باقی نہیں رہتی۔ اسی طرح، اگر دنیا میں برائی نہ ہو تو انسان کے لیے اچھائی کا انتخاب کرنا ممکن نہ ہو۔

اگرچہ دنیا میں بعض معصوم افراد کو شدید مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے، لیکن اللہ تعالیٰ ان کے لیے دنیا میں برائی اور تکلیف کے وجود کا جواز فراہم کرنے کے ساتھ ساتھ ان کے دکھوں کا بدلہ بھی دیتا ہے۔ آخر کار، وہ تمام مومن جو دنیا میں تکلیف کا شکار ہوئے اور معصوم رہے، انہیں آخرت میں دائمی خوشی اور نعمتوں سے نوازا جائے گا۔ ان کی ساری تکلیف، چاہے وہ تمام زندگی برداشت کی گئی ہوں، ہمیشہ کے لیے بھلا دی جائیں گی۔

نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

”... وہ شخص جو دنیا میں سب سے زیادہ مصیبتوں کا شکار ہوا اور جنت کے لیے مقدر تھا، اسے لایا جائے گا اور صرف ایک لمحے کے لیے جنت میں ڈبو دیا جائے گا۔ پھر

اس سے پوچھا جائے گا: 'اے آدم کے بیٹے، کیا تم نے کبھی کوئی تکلیف دیکھی؟ کیا تم نے کبھی کوئی سختی محسوس کی؟ وہ جواب دے گا: نہیں میرے رب، اللہ کی قسم، میں نے کبھی کوئی تکلیف نہیں دیکھی اور نہ کبھی سختی محسوس کی۔ (۱)

4. اختیار اور ذمہ داری

خدا نے انسان کو آزاد ارادہ (Free Will) دیا ہے۔ یہ آزادی انسان کو اچھائی اور برائی کے درمیان انتخاب کرنے کی صلاحیت دیتی ہے۔

ایک چاقو بنانے والا چاقو بناتا ہے، جو بذات خود ایک مفید چیز ہے۔ لیکن اگر کوئی اس چاقو سے کسی کو نقصان پہنچائے تو اس کا ذمہ دار چاقو بنانے والا نہیں بلکہ وہ شخص ہوگا جو اسے غلط طریقے سے استعمال کرے گا۔ اسی طرح، خدا نے برائی کو انتخاب کا ایک ذریعہ بنایا ہے، لیکن اس کا استعمال انسان کے اختیار پر منحصر ہے۔

5. برائی کی تخلیق کا مطلب اور خدا کی حکمت

برائی کے وجود کو خدا کی حکمت کے بغیر سمجھنا ناممکن ہے۔ قرآن میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

"وَنَبَلُّوْكُمْ بِالشَّرِّ وَالْخَيْرِ فِتْنَةً وَإِلَيْنَا تُرْجَعُوْنَ" (۲)

(ترجمہ: اور ہم تمہیں آزماتے ہیں برائی اور بھلائی دونوں سے، اور تم ہماری طرف لوٹائے جاؤ گے۔)

یہ آیت واضح کرتی ہے کہ برائی کا وجود آزمائش اور انسان کے روحانی ارتقاء کا ذریعہ ہے۔ یہ دنیا امتحان کی جگہ ہے، اور ہر برائی یا تکلیف انسان کو اس کی اصل حقیقت

(۱) صحیح مسلم۔

(۲) سورة الانبياء: 35۔

کا احساس دلانے کے لیے ہے۔

نتیجہ: یہ کہنا کہ خدا برائی کا خالق ہے اور اس وجہ سے برا ہے، ایک فلسفیانہ مغالطہ ہے۔ برائی بذات خود کوئی مخلوق نہیں بلکہ اچھائی کی غیر موجودگی ہے۔ خدا نے انسان کو آزاد ارادہ دیا تاکہ وہ اچھائی اور برائی کے درمیان انتخاب کر سکے۔ برائی کا وجود ایک آزمائش ہے جو انسان کو اس کی ذمہ داری، اس کی اصلاح، اور اللہ کی قربت کا موقع فراہم کرتا ہے۔ یہ دنیا عارضی ہے، اور آخرت میں ہر اچھائی اور برائی کا مکمل انصاف ہوگا۔ لہذا، خدا کو برائی کے وجود کی بنیاد پر برا کہنا حقیقت سے بہت دور ہے۔

اعتراض نمبر 8: اگر خدا موجود ہے تو وہ اپنی موجودگی کا

واضح ثبوت کیوں نہیں دیتا؟

یہ اعتراض اکثر ان لوگوں کی طرف سے کیا جاتا ہے جو خدا کے غیر مرئی ہونے کو اس کے وجود کے انکار کی دلیل کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ اس سوال کا جواب دینے کے لیے ہمیں چند اہم نکات پر غور کرنا ہوگا

1. واضح ثبوت اور انسانی آزادی

اگر خدا اپنی موجودگی کا واضح اور مستقل مظاہرہ کرتا، جیسے ہر وقت معجزات دکھاتا یا آسمان پر اپنی موجودگی کا اعلان کرتا، تو انسان کے پاس اپنی آزادی اور ایمان کا کوئی حقیقی موقع نہ رہتا۔

اگر ایک امتحان میں استاد ہر سوال کا جواب دے دے تو اس امتحان کی کوئی حیثیت باقی نہیں رہتی۔ اسی طرح، اگر خدا اپنی موجودگی کو ہر وقت براہ راست ظاہر کرے، تو انسان کے لیے آزمائش، اختیار، اور ایمان کا تصور بے معنی ہو جائے گا۔

خدا نے انسان کو عقل، فطرت، اور کائنات کی نشانیوں کے ذریعے اپنی موجودگی کو پہچاننے کا موقع دیا ہے، تاکہ وہ اپنی آزادی سے ایمان لائے۔

2. خدا کی نشانیاں ہر جگہ موجود ہیں

خدا نے کائنات میں بے شمار نشانیاں رکھی ہیں جو اس کی موجودگی کی گواہی دیتی ہیں۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

"إِنَّ فِي خَلْقِ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ وَخْتِلَافِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ
لَآيَاتٍ لِّأُولِي الْأَلْبَابِ" (۱)

(ترجمہ: بے شک آسمانوں اور زمین کی تخلیق اور رات دن کے بدلنے میں عقل والوں کے لیے نشانیاں ہیں۔)

یہ نشانیاں:

کائنات کی ترتیب، جیسے زمین کا محور اور سورج کی روشنی۔

انسانی جسم کا پیچیدہ نظام، جیسے دل، دماغ، اور ڈی این اے۔

فطرت کے حسین مناظر، جیسے پہاڑ، سمندر، اور آسمان۔

اگر آپ ایک موبائل فون کو دیکھیں، تو آپ یہ نہیں کہہ سکتے کہ یہ خود بخود وجود میں آیا۔ بلکہ یہ کسی ذہن بنانے والے کی تخلیق ہے۔ اسی طرح، کائنات کا منظم نظام کسی عظیم خالق کی نشاندہی کرتا ہے۔

3. غیر مرئی ہونا خدا کی عظمت کو ظاہر کرتا ہے

خدا کا غیر مرئی ہونا اس کی عظمت اور کمال کی علامت ہے، نہ کہ کمزوری۔

ہوا کو کوئی نہیں دیکھ سکتا، لیکن ہم اس کی موجودگی کو محسوس کرتے ہیں۔

اسی طرح، انٹرنیٹ کے سگنلز کو دیکھنا ممکن نہیں، لیکن ان کے اثرات کو ہر روز محسوس کیا جاتا ہے۔ خدا اپنی نشانیوں کے ذریعے اپنی موجودگی کا احساس دلاتا ہے، چاہے ہماری آنکھیں اسے براہ راست نہ دیکھ سکیں۔

4. ایمان کا حسن

ایمان کا اصل حسن اسی میں ہے کہ انسان اپنی عقل اور شعور کے ذریعے خدا کی موجودگی کو تسلیم کرے، بغیر کسی زبردستی یا واضح مداخلت کے۔ اگر خدا ہر وقت خود کو ظاہر کرے تو ایمان کا تصور ختم ہو جائے گا

5. تاریخ میں معجزات اور انکار کی مثالیں

تاریخ گواہ ہے کہ خدا نے مختلف انبیاء کے ذریعے معجزات دکھائے، لیکن بہت سے لوگوں نے پھر بھی انکار کیا۔

فرعون نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے معجزات دیکھے، لیکن اپنی ضد اور تکبر کی وجہ سے انکار کر دیا۔

قریش کے کفار نے نبی اکرم ﷺ کے معجزات دیکھے، لیکن ایمان نہ لائے۔ کیا یہ واضح نہیں کرتا کہ معجزات یا واضح ثبوت ان لوگوں کو قائل نہیں کر سکتے جن کے دل میں ضد اور تکبر ہو۔

یہ دنیا آزمائش کی جگہ ہے، اور آخرت میں ہر چیز واضح ہو جائے گی۔ لیکن اس وقت ایمان لانے کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا، کیونکہ وہ وقت فیصلہ سنائے جانے کا ہوگا، نہ کہ آزمائش کا۔

نتیجہ: خدا کی موجودگی کے واضح ثبوت کا مطالبہ ایک سطحی اعتراض ہے۔ خدا نے اپنی نشانیاں کائنات میں ہر جگہ رکھی ہیں تاکہ انسان اپنی عقل اور شعور کے ذریعے

اسے پہچانے۔ خدا کا غیر مرئی ہونا اس کی حکمت اور عظمت کو ظاہر کرتا ہے، اور ایمان کا حصن اسی میں ہے کہ انسان اپنی آزادی سے، نشانیوں کو دیکھ کر، خدا کو تسلیم کرے۔ یہ دنیا امتحان کی جگہ ہے، اور ہر انسان کو اپنی عقل، شعور، اور اختیار سے خدا کو پہچاننا ہوگا۔

اعتراض نمبر 9: مذہب نے تاریخ میں جنگوں اور خونریزی

کو کیوں اجازت دی؟

یہ اعتراض اکثر تاریخ کے کچھ واقعات کو بنیاد بنا کر کیا جاتا ہے، جس میں مذہب کو جنگوں اور خونریزی کا ذمہ دار ٹھہرایا جاتا ہے۔ اس اعتراض کو سمجھنے اور اس کا منطقی، تاریخی اور دینی جواب دینے کے لیے درج ذیل نکات پر غور ضروری ہے:

1. مذہب جنگ کا آغاز نہیں کرتا بلکہ امن کی تعلیم دیتا ہے

تمام بڑے مذاہب، خصوصاً اسلام، نے ہمیشہ امن، انصاف، اور انسانیت کی بھلائی کی تعلیم دی ہے۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

"وَلَا تُفْسِدُوا فِي الْأَرْضِ بَعْدَ إِصْلَاحِهَا" - (۱)

(ترجمہ: اور زمین میں اصلاح کے بعد فساد نہ کرو۔)

اسلام میں جنگ کی اجازت صرف دفاع کے لیے ظلم کے خاتمے، اور مظلوموں کی مدد کے لیے دی گئی ہے، نہ کہ ظلم یا طاقت کے اظہار کے لیے۔

2. جنگ کی حقیقت اور تاریخی عوامل

یہ اعتراض مذہب کو جنگوں اور خونریزی کا ذمہ دار ٹھہراتا ہے، لیکن اگر تاریخ کا گہرائی سے جائزہ لیا جائے تو حقیقت یہ واضح ہوتی ہے کہ سب سے بڑے مظالم انہی

نظاموں کے تحت ہوئے جو الحاد اور سیکولرازم کے نظریے پر قائم تھے۔ اس اعتراض کے مختلف پہلوؤں کا جائزہ لیا گیا ہے تاکہ حقیقت کو سمجھا جاسکے۔

مثالیں: صلیبی جنگیں: بظاہر مذہب کے نام پر لڑی گئیں، لیکن حقیقت میں یہ زمین اور طاقت کے حصول کے لیے تھیں۔

پہلی اور دوسری عالمی جنگیں: یہ تاریخ کی سب سے بڑی جنگیں تھیں، جن کا مذہب سے کوئی تعلق نہیں تھا بلکہ یہ قوم پرستی، سامراجیت، اور اقتصادی مفادات کی بنا پر ہوئیں۔

سوویت یونین: 1937 میں "سانسی الحاد" کے نام پر 300,106 مذہبی علماء کو قتل کیا گیا۔

چین: ماؤزے تنگ کے تحت مذہب مخالف مہمات میں لاکھوں افراد مارے گئے۔ نازی جرمنی: ہولوکاسٹ میں 6 ملین یہودیوں کا قتل اس نظریے پر مبنی تھا کہ انسانی زندگی کا کوئی مقدس تصور نہیں۔

ڈیوڈ برلنسکی اپنی کتاب **The Devil's Delusion** میں ایک دل دہلا دینے والا واقعہ بیان کرتے ہیں:

"مشرقی یورپ میں کہیں ایک ایس ایس افسر نے اپنی مشین گن سنبھالی اور ایک بزرگ ہاسیدی یہودی کو دیکھا جو اپنی قبر کھود رہا تھا۔ یہودی نے سیدھا کھڑے ہو کر اپنے قاتل سے کہا، خدا تمہارے عمل کو دیکھ رہا ہے۔ پھر اسے گولی مار دی گئی۔ ہٹلر، اسٹالن، ماؤ اور ان کے جیسے بہت سے افراد اس بات پر یقین نہیں رکھتے تھے کہ خدا ان کے اعمال کو دیکھ رہا ہے۔ ان کا یہ یقین ہی بیسویں صدی کے مظالم کی بنیاد بنا۔" (۱)

مارلن رابنس ہارپر میگزین میں لکھتی ہیں:

”ڈاکٹر کا یہ دعویٰ کہ الحاد تشدد کا سبب نہیں بنتا، بے بنیاد ہے۔ تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ فرانس، اسپین، سوویت یونین اور چین میں مذہب کے خلاف تشدد کی مہمات چلائی گئیں۔ یہ تمام مہمات خدا اور مذہب کے انکار کے نتیجے میں وجود میں آئیں۔ (۲)

روشن خیالی اور الحادی مظالم

روشن خیالی کو انسانی ترقی اور امن کا سرچشمہ کہا جاتا ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ انہی خیالات نے بیسویں صدی کے سب سے بڑے مظالم کو جنم دیا۔
جان گرے اپنی کتاب **Black Mass** میں لکھتے ہیں:

”بیسویں صدی کے دہشت گردی کے واقعات کے پیچھے روشن خیالی کے خیالات کارفرما تھے۔ کمیونسٹ حکومتیں ایک ایسی خیالی دنیا کی تشکیل کے لیے وجود میں آئیں جس کی جڑیں روشن خیالی کے اصولوں میں تھیں۔ لیننزم اور نازی ازم نے انسانیت کو بدلنے کی کوشش کی، اور ان کی اس کوشش نے لاکھوں انسانوں کو موت کے گھاٹ اتارا۔“ (۱)

سیکولر ازم: برداشت یا آمریت؟

سیکولر ازم کو عمومی طور پر ”شک“ اور ”برداشت“ کے مترادف سمجھا جاتا ہے، لیکن عملی طور پر یہ نظریہ ایک سخت آمرانہ طرز عمل کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ ایلن بلوم اپنی کتاب **The Closing of the American Mind** میں لکھتے ہیں:

(2) Harper's Magazine, October 20, 2006.

(1) Black Mass: Apocalyptic Religion and the Death of Utopia, S: 36-39)

امریکی جامعات میں طلباء "حقیقت" کو نسبی (Relative) سمجھتے ہیں، لیکن اپنے سیکولر نظریات پر اتنے سخت گیر ہیں کہ ان سے اختلاف کرنے والے کو جرم کا مرتکب قرار دے کر خاموش کر دیا جاتا ہے۔

یہ رویہ ظاہر کرتا ہے کہ سیکولر ازم مذہب کے خلاف "برداشت" کا دعویٰ تو کرتا ہے، لیکن خود اپنی تنقید کو برداشت نہیں کرتا۔ جب خدا کے وجود اور مذہب کو رد کیا جاتا ہے، تو انسانی زندگی کی قدر ختم ہو جاتی ہے، اور ظلم و جبر کو ایک نیا جواز ملتا ہے۔

مذہب اور جنگ کا حقیقی تعلق

یہ کہنا کہ مذہب جنگوں کا سبب ہے، سچی اور غیر منصفانہ دعویٰ ہے۔ مذہب نے ہمیشہ امن، انصاف، اور انسانیت کی بھلائی کی تعلیم دی ہے۔ جنگ کو صرف دفاعی اور ظلم کے خاتمے کے لیے جائز قرار دیا گیا ہے۔

قرآن میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

"وَقَاتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ الَّذِينَ يُقَاتِلُونَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوا إِنَّ

اللَّهُ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِينَ" (۱)

(ترجمہ: اور تم ان لوگوں کے ساتھ لڑو جو تم سے لڑتے ہیں، اور حد سے تجاوز نہ کرو، بے شک اللہ حد سے بڑھنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔)

الحاد کا دو غلامعیار

مذہب پر جنگوں اور خونریزی کا الزام لگانے والے خود اپنے الحادی نظریات کے تحت ہونے والے مظالم کو نظر انداز کیوں کرتے ہیں۔

مارکسٹ کمیونزم: مذہب کو ”عوام کے لیے ایون“ قرار دے کر انقلابی مہمات کے تحت لاکھوں افراد کو قتل کیا گیا۔

نازی نظریہ: انسانی زندگی کی بے قدری اور اخلاقیات کا انکار اس بات کا ثبوت ہیں کہ جب خدا اور مذہب کو رد کیا جاتا ہے تو ظلم اور جبر کی راہیں کھلتی ہیں۔

جس کی اپنی تاریخ سیاہی سے بھری ہو، یہ حیرت کی بات ہے کہ وہی دوسروں پر الزامات عائد کر رہا ہے۔ اسلام نے کبھی مذہب کے نام پر دہشتگردی کو قبول نہیں کیا، بلکہ ایسے افعال کے خلاف ہمیشہ ڈٹ کر کھڑا ہوا ہے۔ تاہم، اعتراض برائے اعتراض کرنے والوں کو دوسروں پر الزام تراشی سے پہلے اپنی تاریخ اور کردار کا جائزہ لینا چاہیے۔

اخلاقیات اور انسانی زندگی کی قدر

مذہب انسان کو اخلاقیات، انصاف، اور انسانی زندگی کی قدر کا درس دیتا ہے۔ یہ اخلاقیات ہی ہیں جو انسان کو اچھائی کی طرف مائل کرتی ہیں۔ الحاد، جو کسی اعلیٰ اخلاقی معیار کو تسلیم نہیں کرتا، انسانی زندگی کو محض ایک مادی وجود سمجھتا ہے۔
ڈیوڈ برنسکی کے الفاظ میں:

”ہٹلر، اسٹالن، ماؤ اور ان کے جیسے بہت سے افراد اس بات پر یقین نہیں رکھتے تھے کہ خدا ان کے اعمال دیکھ رہا ہے۔ ان کا یہ یقین ہی بیسویں صدی کے مظالم کی بنیاد بنا۔ (۱)“

اسلام میں جنگ کے اصول

اسلام میں جنگ کے لیے سخت اصول دیے گئے ہیں، تاکہ انسانیت کو نقصان نہ پہنچے اور ظلم کا خاتمہ ہو۔ مثلاً یہ کہنا:
کسی بچے، عورت یا بوڑھے کو قتل نہ کرو، کسی درخت کو نہ کاٹو، اور عبادت گاہوں کو نقصان نہ پہنچاؤ۔

قرآن میں اصول:

"وَقَاتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ الَّذِينَ يُقَاتِلُونَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوا" (۱)

ترجمہ: اور اللہ کی راہ میں ان لوگوں سے لڑو جو تم سے لڑتے ہیں، لیکن حد سے تجاوز نہ کرو۔

یہ اصول واضح کرتے ہیں کہ اسلام میں جنگ صرف ایک ناگزیر ضرورت کے تحت اور ظلم کے خاتمے کے لیے کی جاتی ہے۔

خونریزی کا ذمہ دار انسان ہے، مذہب نہیں

مذہب نے ہمیشہ امن، اخلاقیات، اور انسانیت کی بھلائی کی تعلیم دی ہے، لیکن جب انسان اپنے ذاتی مفادات، طاقت، اور انا کے زیر اثر آتا ہے، تو وہ مذہب کو اپنے غلط اعمال کا جواز بناتا ہے۔

مثال: اسپین میں مسلمانوں اور یہودیوں کے ساتھ ظلم کو مذہب کے نام پر کیا گیا، لیکن حقیقت میں یہ سیاسی اور نسلی دشمنی کی بنا پر تھا۔

مذہب کے بغیر بھی جنگیں ہوں

اگر یہ دعویٰ کیا جائے کہ مذہب جنگوں کا سبب ہے، تو پھر مذہب کے بغیر ہونے والی جنگوں اور مظالم کو کیسے جواز دیا جائے؟
یہ مظالم اس بات کا ثبوت ہیں کہ جنگ اور خونریزی کی اصل وجہ انسانی لالچ اور طاقت کی خواہش ہے، نہ کہ مذہب۔

مذہب نے امن کے قیام میں کردار ادا کیا

مذہب نے تاریخ میں کئی مواقع پر امن قائم کرنے میں کلیدی کردار ادا کیا ہے۔
صلح حدیبیہ: نبی اکرم ﷺ نے مکہ کے مشرکین کے ساتھ معاہدہ کیا تا کہ خونریزی سے بچا جاسکے۔

فتح مکہ: جب مکہ فتح ہوا تو نبی اکرم ﷺ نے اپنے دشمنوں کو معاف کر دیا اور کسی کو بھی نقصان پہنچانے کی اجازت نہیں دی۔

نتیجہ: مذہب کو جنگوں اور خونریزی کا ذمہ دار ٹھہرانا ایک سطحی اعتراض ہے۔ تاریخ یہ ثابت کرتی ہے کہ زیادہ تر جنگوں کی وجہ سیاسی، سماجی، اور اقتصادی مفادات تھے، نہ کہ مذہب۔ اسلام اور دیگر مذاہب نے ہمیشہ انسانیت کی بھلائی، امن، اور انصاف کی تعلیم دی ہے۔ جنگ ایک آخری راستہ ہے جو صرف ظلم کے خاتمے اور انصاف کے قیام کے لیے اختیار کی جاتی ہے۔

مذہب کو ظلم اور جنگ کا سبب سمجھنا ایک غیر منطقی سوچ ہے، اور تاریخ کے حقائق اس دعوے کو رد کرتے ہیں۔

اعتراض نمبر 10: سائنس نے خدا کے وجود کے

دروازے بند کر دیے ہیں

ملاحدین اور مادہ پرست دعویٰ کرتے ہیں کہ سائنس نے خدا کے وجود کو غیر ضروری اور ناقابل قبول بنا دیا ہے۔ ان کے مطابق، سائنس صرف مادی دنیا کا تجزیہ کرتی ہے اور حقیقت صرف وہی ہے جو تجربات اور مشاہدات کے ذریعے ثابت ہو سکے۔ چونکہ خدا کا وجود سائنس کے ذریعے ثابت نہیں کیا جاسکتا، لہذا ان کے نزدیک خدا کا تصور ایک واہمہ ہے۔

جواب: سائنس انسانی کوشش کا ایک ذریعہ ہے جس کے ذریعے مادی دنیا کے کام کرنے کے طریقوں کو سمجھنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ معروف ریاضی دان اور فلسفی برٹریڈ رسل سائنس کو یوں بیان کرتے ہیں:

سائنس مشاہدے اور اس پر مبنی استدلال کے ذریعے دنیا کے خاص حقائق کو دریافت کرنے اور ان حقائق کو ایک دوسرے سے جوڑنے والے قوانین کو سمجھنے کی کوشش کا نام ہے۔ (۱)

ملاحدین کی سب سے بڑی غلط فہمی یہ ہے کہ وہ سائنس کو حق و باطل کے درمیان فیصلہ کرنے والا حتمی ذریعہ سمجھتے ہیں اور یہ مانتے ہیں کہ سائنس کے پاس ہر سوال کا جواب موجود ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ سائنس کے اپنے کچھ حدود ہیں، اور اس کا اعتراف خود سائنس کرتی ہے۔

ایک اور مغالطہ یہ ہے کہ سائنس قطعی حقائق (Certainty) تک پہنچاتی ہے،

جبکہ حقیقت اس کے برعکس ہے۔ سائنسی نظریات اور مشاہدات وقت کے ساتھ تبدیل ہو سکتے ہیں، اور بعض اوقات ماضی کے حقائق بھی نئے شواہد کی روشنی میں بدل جاتے ہیں۔ سائنسی نقطہ نظر میں کسی نظریے یا حقیقت کا مطلب صرف یہ ہے کہ وہ موجودہ علم اور مشاہدے کے مطابق بہترین تشریح ہے۔

لہذا، اگر قرآن اور سائنس کے درمیان کسی تضاد کا تاثر پیدا ہو، تو اسے مسئلہ نہیں سمجھنا چاہیے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ سائنس کی پوزیشن وقت کے ساتھ بدل سکتی ہے، جبکہ قرآن کا علم ہمیشہ کے لیے اٹل اور حتمی ہے۔

ابتدائی کیمسٹری نے ایک نظریہ پیش کیا کہ تمام جلنے والے مادوں میں ایک عنصر موجود ہوتا ہے جسے فلو جسٹن کہتے ہیں۔ اس نظریہ کے مطابق، جب کوئی جلنے والا مادہ جلتا ہے تو وہ فلو جسٹن خارج کرتا ہے۔ جتنا زیادہ مادہ جلنے کے قابل ہوگا، اس میں فلو جسٹن کی مقدار بھی اتنی ہی زیادہ ہوگی۔ اس نظریہ کو سائنسی برادری نے ایک حقیقت کے طور پر قبول کیا۔

یہ نظریہ اس حد تک کارآمد ثابت ہوا کہ 1772 میں ڈین رتھر فورڈ نے اس کا استعمال کرتے ہوئے نائٹروجن دریافت کیا، جسے اس وقت ”فلو جسٹکیڈ ہوا“ کہا گیا۔ تاہم، بعد میں یہ معلوم ہوا کہ فلو جسٹن کا کوئی وجود نہیں تھا اور یہ ایک غلط نظریہ تھا۔

یہ ان بہت سی مثالوں میں سے ایک ہے جو ظاہر کرتی ہیں کہ ایک نظریہ کام کر سکتا ہے اور نئی سائنسی حقیقتوں کو پیدا کر سکتا ہے، لیکن بعد میں غلط ثابت ہو سکتا ہے۔ سبق واضح ہے: صرف یہ کہ کوئی چیز کام کرتی ہے، اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ حقیقتاً درست ہے۔ (۱)

لہذا، سائنس کو ہی حتمی سچائی سمجھ کر خدا کے تصور کو مسترد کر دینا حماقت کے سوا کچھ نہیں۔

ہیوگا وچ (Hugh Gauch) بجا طور پر فرماتے ہیں کہ ”یہ دعویٰ کرنا کہ سائنس الحاد کی حمایت کرتی ہے، جوش و خروش کے لیے تو اعلیٰ نمبر حاصل کر سکتا ہے لیکن منطق کے لیے کم نمبر پائے گا۔“ (۲)

سائنس کی حدود

سائنس ایک محدود آلہ ہے جو صرف مادی دنیا کے مشاہداتی اور تجرباتی پہلوؤں کا تجزیہ کرتی ہے۔

مادی دنیا تک محدودیت: سائنس ان چیزوں کا تجزیہ کرتی ہے جو محسوس یا تجربے میں لائی جاسکیں، لیکن اس کا دائرہ غیر مادی حقیقتوں جیسے خدا، روح، یا اخلاقیات تک نہیں پہنچتا۔

غیر مادی حقیقتیں: محبت، حسن، اور سچائی جیسی حقیقتوں کو نہ تو کسی تجربے میں ناپا جا سکتا ہے اور نہ ہی کسی مشاہدے میں قید کیا جاسکتا ہے، لیکن یہ حقیقتیں موجود ہیں اور انکار نہیں کی جاسکتیں۔

غیر سائنسی دعویٰ: یہ کہنا کہ ”جو چیز تجربے سے ثابت نہ ہو، وہ موجود نہیں“ بذات خود سائنس کے دائرہ کار سے باہر کا دعویٰ ہے اور غیر سائنسی ہے۔

|| مادیت پرستی: ایک غیر سائنسی نظریہ ||

مادہ پرستی (Materialism) کا یہ دعویٰ کہ ”صرف مادی دنیا ہی حقیقت ہے“ سائنس کے دائرے میں آتا ہی نہیں بلکہ یہ ایک فلسفیانہ دعویٰ ہے۔

محدود سوچ: مادہ پرستی کا یہ کہنا کہ ”جو چیز دیکھی یا محسوس نہ ہو، وہ موجود نہیں غیر منطقی ہے۔“

مثال: اگر کوئی یہ دعویٰ کرے کہ ”ہوا موجود نہیں کیونکہ اسے دیکھا یا چھوا نہیں جا سکتا“ تو یہ دعویٰ واضح طور پر غلط ہوگا، کیونکہ ہوائی موجودگی کے اثرات (جیسے سانس لینا، حرکت کرنا) ہر وقت ہمارے ارد گرد محسوس کیے جاسکتے ہیں۔

بالکل اسی طرح، مادی دنیا سے باہر موجود حقائق جیسے روح، خدا، اور دیگر ماورائے طبعی حقائق کے وجود کو مادی حواس سے محسوس نہ کر سکتا، ان کے وجود کی نفی نہیں کرتا۔ مادہ پرستی کا یہ دعویٰ حقیقت کو مادی دنیا تک محدود کر دیتا ہے، جو کہ ایک غیر منطقی اور ناقص سوچ ہے۔

■ سائنس اور تخیل: لازم و ملزوم

سائنس اور تخیل کے باہمی تعلق کو دیکھتے ہوئے یہ واضح ہوتا ہے کہ سائنس خود غیر مرنی حقائق کو شواہد اور منطق کی بنیاد پر تسلیم کرتی ہے۔ بلیک ہولز، کشش ثقل کی لہریں، اور ڈارک میٹر جیسے نظریات اس بات کا ثبوت ہیں کہ سائنس صرف براہ راست مشاہدے تک محدود نہیں، بلکہ شواہد اور منطقی استدلال کی بنیاد پر غیر مرنی حقیقتوں کو قبول کرتی ہے۔

آئن سٹائن کا نظریہ اضافیت بھی اسی اصول پر مبنی تھا، جسے پہلے تخیل اور منطق سے پیش کیا گیا اور بعد میں تجرباتی شواہد نے اس کی تصدیق کی۔ یہی اصول ان حقائق پر بھی لاگو ہوتا ہے جو سائنس کے دائرے سے باہر ہیں، جیسے خدا کا وجود۔

اگر سائنس غیر مرنی حقائق کو شواہد کی بنیاد پر قبول کر سکتی ہے، تو خدا اور ماورائی حقیقتوں کا انکار کرنا محض اس لیے کہ وہ براہ راست مشاہدے میں نہیں آتیں، غیر منطقی ہے۔ یہ بات واضح کرتی ہے کہ حقیقت کو جانچنے کا واحد معیار حواس یا مشاہدہ نہیں ہو سکتا،

اور ماورائی حقائق کو بھی دلیل اور منطق کی بنیاد پر تسلیم کیا جاسکتا ہے۔
 کائنات کے قوانین: سائنس کی دریافتیں، جیسے کہ بگ بینک تھیوری اور کائنات کی ترتیب، خدا کے وجود کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔ بگ بینک یہ بتاتا ہے کہ کائنات کسی خاص وقت میں وجود میں آئی، جو کسی اعلیٰ سبب (Cause) کی موجودگی کا تقاضا کرتا ہے۔

مادیت کا تضاد

یہ کہنا کہ ”سائنس نے خدا کے وجود کو رد کر دیا ہے“ کبھی تضادات کا شکار ہے:
 ثبوت کا مطالبہ: سائنس نے کبھی یہ ثابت نہیں کیا کہ خدا موجود نہیں ہے۔
 غیر سائنسی رویہ: ”جو چیز ثابت نہ ہو سکے، وہ موجود نہیں“ بذات خود غیر سائنسی دعویٰ ہے، کیونکہ سائنس اس طرح کے کلی دعوے کرنے کا ذریعہ نہیں۔

مذہب اور سائنس کا تعلق

مذہب اور سائنس ایک دوسرے کے مخالف نہیں بلکہ دونوں کے دائرہ کار مختلف ہیں:
 سائنس: یہ مادی دنیا کے قوانین اور تفصیلات کا تجزیہ کرتی ہے۔
 مذہب: یہ اخلاقیات، روحانیت، اور وجودی سوالات کا جواب دیتا ہے۔
 ہم آہنگی: مذہب اور سائنس میں ہم آہنگی ممکن ہے، کیونکہ سائنس کائنات کے مادی پہلوؤں کو بیان کرتی ہے، اور مذہب ان کے ماورائی پہلوؤں کی وضاحت کرتا ہے۔
نتیجہ: سائنس نے خدا کے وجود کے دروازے بند نہیں کیے بلکہ اس نے خدا کے وجود کی طرف اشارے دیے ہیں۔ سائنس کا دائرہ مادی دنیا تک محدود ہے، جبکہ خدا کے وجود کا سوال ماورائی اور غیر مادی ہے۔ یہ کہنا کہ ”سائنس نے خدا کے

وجود کو غیر ضروری بنا دیا ہے ”خود ایک غیر سائنسی اور غیر منطقی دعویٰ ہے۔ ایمان اور سائنس ایک دوسرے کے متبادل نہیں بلکہ دونوں مختلف زاویوں سے حقیقت کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔

اعتراض نمبر 11: مذاہب کو سوسائٹی میں نظم قائم

کرنے کے لیے گھڑ لیا گیا ہے

جواب: یہ اعتراض اکثر ان افراد کی جانب سے کیا جاتا ہے جو مذاہب کو انسانی معاشرتی تنظیم کا محض ایک آلہ سمجھتے ہیں، اور یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ مذاہب کو صرف انسانی ضروریات اور سوسائٹی میں نظم قائم کرنے کے لیے وضع کیا گیا۔ یہ دعویٰ بظاہر معقول لگتا ہے لیکن اس میں کئی مفروضات اور منطقی خامیاں موجود ہیں۔

سب سے پہلے، یہ کہنا کہ مذاہب کو گھڑ لیا گیا، محض ایک مفروضہ ہے جس کا کوئی ٹھوس تاریخی یا سائنسی ثبوت موجود نہیں۔ یہ دعویٰ نہ تو کسی واضح دلیل پر مبنی ہے اور نہ ہی اسے ثابت کیا جاسکتا ہے۔

اگر کوئی شخص یہ کہے کہ مذاہب کو سوسائٹی میں نظم قائم کرنے کے لیے گھڑا گیا، تو ہم جواباً کہہ سکتے ہیں کہ یہی بات الحاد پر بھی لاگو ہوتی ہے۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ الحاد کو لوگوں نے اپنی خواہشات، آزادی، اور ذمہ داری سے فرار کے لیے گھڑا ہو؟ اگر معترضین بغیر دلیل کے یہ دعویٰ کر سکتے ہیں کہ مذاہب گھڑے گئے ہیں، تو یہی بات ہم الحاد پر بھی کہہ سکتے ہیں۔

یہ بات واضح رہنی چاہیے کہ ”الزامی جواب“ کسی نظریے کو باطل ثابت کرنے کا حتمی طریقہ نہیں ہوتا، بلکہ اس کا مقصد معترضین کے مفروضات کی کمزوری کو ظاہر کرنا ہوتا

ہے۔ ہم یہ بات ثابت کر چکے ہیں کہ الحاد اکثر خواہشات کے تابع ہوتا ہے، اور یہ بات تاریخی اور فلسفی شواہد کے ساتھ پیش کی گئی ہے۔ ہمارا مؤقف محض الزامی نہیں، بلکہ شواہد اور دلائل پر مبنی ہے۔

یہ کہنا کہ مذاہب کو معاشرتی نظم کے لیے بنایا گیا، انفرادی اور تاریخی حقائق کو نظر انداز کرتا ہے۔ مذاہب انسانی زندگی کے گہرے اور فلسفیانہ سوالات کا جواب فراہم کرتے ہیں، جیسے:

انسان کہاں سے آیا؟ زندگی کا مقصد کیا ہے؟ موت کے بعد کیا ہوتا ہے؟ یہ سوالات سوسائٹی کے نظم و ضبط سے کہیں زیادہ گہرے اور اہم ہیں۔ اگر مذاہب کو صرف معاشرتی نظم کے لیے گھڑا جاتا، تو وہ ان فلسفیانہ اور روحانی مسائل پر بات نہ کرتے جنہیں سائنس بھی حل کرنے سے قاصر ہے۔

اگر مذاہب کو انسانوں نے گھڑا ہوتا، تو تمام مذاہب ایک جیسے ہوتے۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ ہر مذہب کا خدا، کائنات، اور انسان کی زندگی کے بارے میں تصور مختلف ہے۔ اگر مذاہب انسانی ایجاد ہوتے، تو ان میں یکسانیت پائی جاتی، جیسا کہ انسان کی دیگر ایجادات میں ہے۔ یہ اختلاف اور تنوع اس بات کا ثبوت ہے کہ مذاہب کا ماخذ انسانی خواہشات نہیں، بلکہ ایک ماورائی حقیقت ہے۔

سوال الحاد کے حامیوں سے:

الحادی نظام کے تحت قائم تمام حکومتوں نے ظلم، تشدد، اور انتشار کے سوا کچھ نہیں دیا۔ سوال یہ ہے کہ:

سوویت یونین، نازی جرمنی، یا چین جیسے الحادی نظاموں نے معاشرتی نظم کے بجائے کون سا اخلاقی اور سماجی نظام قائم کیا؟

کیا یہ حکومتیں واقعی انسانیت کی فلاح کے لیے کام کر رہی تھیں، یا یہ اپنے نظریات کے تحت قتل و غارت اور افراتفری کا باعث بنیں؟

جب مذاہب پر الزام لگایا جاتا ہے کہ یہ انتشار کا سبب ہے، تو کیا الحاد کے ان مظالم کی وضاحت پیش کی جاسکتی ہے۔

لہذا، معاشرتی نظم و ضبط کے قیام کے لیے مذاہب کے وجود کا مفروضہ دلیل کا محتاج ہے۔ اور اس دلیل کی عدم موجودگی اس خیالی مفروضے کو بے وزن کر دیتی ہے۔

اعتراض نمبر 12: اگر یہ دنیا آزمائش ہے تو یہ کہاں کا انصاف ہے

کہ مسلمانوں کے لیے آزمائش کم ہو کیونکہ وہ مسلم گھرانوں میں پیدا

ہوئے ہیں، جبکہ غیر مسلم بے چارے غیر مسلم گھرانوں میں پیدا

ہوئے ہیں؟ اب اگر وہ اس امتحان میں ناکام ہو جاتے ہیں تو ان

کی غلطی کیوں؟

جواب: آزمائش ہر انسان کے لیے مختلف ہوتی ہے

اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کو اس کی حیثیت، حالات، اور مقام کے مطابق آزمائش

میں ڈالا ہے۔ قرآن مجید میں اللہ فرماتا ہے:

"لَا يُكَلِّفُ اللَّهُ نَفْسًا إِلَّا وُسْعَهَا" (۱)

(ترجمہ: اللہ کسی جان پر اس کی طاقت سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالتا۔)

اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ اللہ ہر انسان کو اس کی استطاعت کے مطابق آزماتا ہے۔ جو شخص غیر مسلم گھرانے میں پیدا ہوا، اس کے لیے آزمائش یہ ہے کہ وہ اپنی عقل اور فطرت کو استعمال کرتے ہوئے حق کو پہچانے۔ جبکہ مسلم گھرانے میں پیدا ہونے والے کے لیے آزمائش یہ ہے کہ وہ اپنی تربیت اور دین کی نعمت کو صحیح طریقے سے استعمال کرے۔ دونوں کی آزمائش الگ ہے، لیکن دونوں کے لیے انصاف کے تقاضے برابر ہیں۔

امتحان دونوں کے حق میں یکساں ہے۔ اب اگر ایک غیر مسلم حق کی تلاش میں کامیاب ہو جاتا ہے تو وہ جنت کا مستحق بنے گا، جبکہ وہ شخص جو مسلم گھرانے میں پیدا ہوا لیکن حق سے انحراف کر بیٹھا، جہنم میں پھینک دیا جائے گا۔ دونوں اپنے اعمال اور عقل کے استعمال کی بنیاد پر یا تو جنت کے مستحق ہوں گے یا جہنم کے۔ لہذا، اصل اہمیت کسی کے مسلم یا غیر مسلم گھرانے میں پیدا ہونے کی نہیں بلکہ اپنے رب کو پہچاننے اور اس پر ایمان رکھنے کی ہے۔ یہی کامیابی کا حقیقی معیار ہے۔

مسلم گھرانے میں پیدا ہونا آزمائش کو ختم نہیں کرتا

یہ سوچنا کہ مسلم گھرانے میں پیدا ہونا آزمائش کو آسان بنا دیتا ہے، حقیقت کے خلاف ہے۔ مسلم گھرانے میں پیدا ہونے والے پر بھی بہت سی ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں:

اسے اپنے اعمال کے ذریعے اسلام کے سچے پیروکار ہونے کا ثبوت دینا ہوتا ہے۔

وہ اپنے دین کی صحیح نمائندگی کرے، ورنہ اس کے لیے یہ نعمت قیامت کے دن وبال بن سکتی ہے۔ مسلمانوں کے لیے یہ نعمت بھی آزمائش ہے، کیونکہ انہیں زیادہ علم اور ہدایت ملی ہے، اور ان سے زیادہ حساب لیا جائے گا۔

فطرت انسانی حق کو پہچاننے کا ذریعہ ہے

اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کو ایک ایسی فطرت کے ساتھ پیدا کیا ہے جو حق کو پہچاننے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ قرآن میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

"فَطَرَتُ اللّٰهَ الَّتِي فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا" (۱)

(ترجمہ: یہ اللہ کی فطرت ہے جس پر اس نے لوگوں کو پیدا کیا۔)

یہ فطرت غیر مسلم کے اندر بھی موجود ہے، اور یہی فطرت اسے حق کے قریب کرتی ہے۔ اگر کوئی شخص اس فطرت کو دبا دیتا ہے اور حق کو جاننے کی کوشش نہیں کرتا، تو یہ اس کی اپنی کوتاہی ہوگی۔

نتیجہ: اللہ کا عدل اور رحمت ہر شخص کے حالات کے مطابق ہے۔ مسلم یا غیر مسلم گھرانے میں پیدا ہونا کسی کی کامیابی یا ناکامی کی ضمانت نہیں۔ ہر شخص اپنے اختیار، نیت، اور اعمال کے مطابق آزمائش میں ڈالا جاتا ہے۔ غیر مسلم پر الزام اسی وقت ہوگا جب وہ حق کو ٹھکرا دے یا اپنی فطرت کے خلاف عمل کرے۔ یہ اعتراض اللہ کے عدل کو سمجھنے میں ناکامی کا نتیجہ ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فیصلہ مکمل علم، عدل، اور حکمت پر مبنی ہوتا ہے۔

اعتراض نمبر 13: جب خدا نے وقت اور مکان

(Time and Space) کو پیدا کیا ہے، تو وقت

اور مکان سے پہلے خدا کہاں تھا؟

جواب: یہ سوال بذات خود منطقی مغالطے (Fallacy) پر مبنی ہے کیونکہ اس میں وقت اور مکان کی تخلیق کے بعد کے تصورات کو وقت اور مکان کی تخلیق سے پہلے کے حالات پر مسلط کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ آئیے اس اعتراض کا جواب مندرجہ ذیل نکات میں تفصیل سے دیتے ہیں:

1. وقت اور مکان خدا کی مخلوق ہیں

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

"هُوَ الْأَوَّلُ وَالْآخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ" (۱)

ترجمہ: "وہی اول ہے اور وہی آخر، اور وہی ظاہر ہے اور وہی باطن، اور وہ ہر چیز کو جاننے والا ہے۔"

اللہ تعالیٰ کے لیے "اول" اور "آخر" کا مفہوم یہ ہے کہ وہ ہمیشہ سے موجود ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ وقت اور مکان کو اللہ تعالیٰ نے پیدا کیا، لہذا وہ خود ان دونوں سے ماورا ہے۔ یہ سوال، "خدا وقت اور مکان سے پہلے کہاں تھا؟" درحقیقت غیر منطقی ہے کیونکہ "کہاں" اور "کب" کے تصورات وقت اور مکان کی تخلیق کے بعد پیدا ہوئے۔

یہ سوال ایک منطقی مغالطے کا شکار ہے، جسے فلسفہ میں **Misclassification**

کہا جاتا ہے۔ یعنی کسی ایسی شے کو ایسی کیٹیگری میں رکھ کر سوال کرنا جو اس پر لاگو نہیں ہوتا۔

مثال کے طور پر:

اگر کوئی پوچھے کہ ”رنگ کا ذائقہ کیسا ہوتا ہے؟“ تو یہ سوال بے معنی ہوگا، کیونکہ ”رنگ“ کا تعلق بصری (Visual) دائرے سے ہے جبکہ ”ذائقہ“ کا تعلق حیات (Taste) سے ہے۔

اسی طرح، ”وقت“ اور ”مکان“ خدا کی مخلوق ہیں، اور یہ تصور کرنا کہ وہ وقت اور مکان کی قید میں ہے، منطقی طور پر غلط ہے۔ کسی غیر مادی شے کو مادی دائرے میں شامل کرنا اور اس کا تجزیہ مادی اصولوں کے تحت کرنا سراسر غلط ہے، کیونکہ غیر مادی چیزوں کو سمجھنے کے لیے مادی پیمانے ناکافی اور غیر متعلق ہوتے ہیں۔ یہ منطقی مغالطہ اس وقت پیدا ہوتا ہے جب کسی ایسی شے کو، جو اپنی فطرت میں مادی نہ ہو، مادی قوانین یا تجرباتی اصولوں کے تحت پرکھنے کی کوشش کی جاتی ہے۔

اللہ تعالیٰ ازلی (Eternal) اور ابدی (Timeless) ہے۔ وقت اور مکان اللہ تعالیٰ کی مخلوق ہیں، اور ان کا آغاز اسی وقت ہوا جب اللہ نے انہیں تخلیق کیا۔ اللہ کا وجود نہ تو زمانے کا پابند ہے اور نہ ہی مکان کا محتاج۔ وہ ان دونوں سے پہلے بھی موجود تھا اور ان کے بعد بھی موجود رہے گا۔

لہذا یہ سوال، ”وقت اور مکان سے پہلے خدا کہاں تھا؟“ درحقیقت غیر معقول ہے، کیونکہ خدا ان دونوں کا خالق ہے اور ان سے بالاتر ہے۔

اب ہم ان ملحدین سے سوال کرتے ہیں:

جب آپ خود تسلیم کرتے ہیں کہ وقت اور مکان کی تخلیق ہوئی، تو آپ کیسے خدا کو ان دونوں کی قید میں دیکھتے ہیں؟ اگر آپ کے پاس وقت اور مکان سے پہلے کے حالات کا کوئی ثبوت نہیں، تو آپ کا یہ سوال کیسے معقول ہو سکتا ہے؟

وقت اور مکان کے حوالے سے خدا کے وجود پر اعتراض کرنے والوں سے یہ سوال کیا جاسکتا ہے:

وقت اور مکان کی تخلیق سے پہلے کا فہم کیسے ممکن؟

جب وقت اور مکان خود مخلوق ہیں، تو ان کے بغیر کسی حقیقت کو سمجھنے یا اس کا تجزیہ کرنے کا انسانی عقل پر کیا معیار ہو سکتا ہے؟ ہماری تمام سوچ اور تجربات وقت اور مکان کے اندر محدود ہیں۔ ان دونوں کے بغیر وجود کو پرکھنا یا سمجھنا انسانی ادراک کی حدود سے باہر ہے۔

نتیجہ: یہ سوال کہ ”وقت اور مکان سے پہلے خدا کہاں تھا؟“ ایک غیر معقول اور مغالطہ آمیز سوال ہے۔ خدا وقت اور مکان کی تخلیق سے آزاد ہے اور ان کا خالق ہے۔ وقت اور مکان کو خدا پر لاگو کرنا ایسا ہی ہے جیسے کسی غیر متعلقہ چیز کو کسی غلط دائرے میں رکھ کر سوال کرنا۔

خدا کا وجود ازلی اور ابدی ہے، اور وہ وقت و مکان سے بالاتر ہے۔ ان اعتراضات کے بجائے، انسان کو خدا کے وجود کی عظمت اور اپنی محدود عقل کو تسلیم کرنا چاہیے۔

اعتراض نمبر 14: ”اسلام دوسروں کو ”کافر“ جیسے توہین آمیز لفظ

سے پکارتا ہے، تو ایسے مذہب کو کیوں مانا جائے؟“

جواب: یہ اعتراض درحقیقت ”کفر“ کی اسلامی اصطلاح کو صحیح طور پر نہ سمجھنے کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے۔ اس میں یہ فرض کر لیا جاتا ہے کہ ”کافر“ کا لفظ کسی توہین یا تحقیر کے لیے استعمال ہوتا ہے، جبکہ حقیقت اس کے برعکس ہے۔ لہذا، ضروری ہے کہ پہلے ”کفر“

کے اصل معنی اور اس کے مفہوم کو واضح کیا جائے تاکہ یہ معلوم ہو کہ اسلام میں اس اصطلاح کا استعمال کن بنیادوں پر ہوتا ہے۔

کفر کا حقیقی مفہوم

کفر ایک قرآنی اصطلاح ہے جس کا لغوی معنی ”چھپانا“ یا ”ڈھانپنا“ ہے۔ اصطلاحی طور پر، کفر کا مطلب حق کو جان بوجھ کر رد کرنا یا انکار کرنا ہے۔ اسلامی تعلیمات کے مطابق، ایمان اور کفر ایک دوسرے کی ضد ہیں، اور اس کا بہترین خلاصہ درج ذیل اصول میں بیان کیا گیا ہے:

"لأن الأشياء تعرف بأضدادها"

(چیزوں کو ان کے متضاد سے پہچانا جاتا ہے۔)
لہذا، کفر کو سمجھنے کے لیے پہلے ایمان کا تصور جاننا ضروری ہے۔

ایمان کیا ہے؟

اسلام میں ایمان کا مطلب یقین اور تصدیق ہے، اور اس کا بنیادی مفہوم یہ ہے کہ ایک شخص اللہ تعالیٰ اور اس کے بھیجے گئے احکامات پر یقین رکھے۔ ایمان درج ذیل بنیادی عقائد پر مشتمل ہے:

1. اللہ کی وحدانیت (توحید)
 2. آخرت پر ایمان (حیات بعد الموت)
 3. حضرت محمد ﷺ کی نبوت (رسالت)
 4. فرشتوں، الہامی کتابوں، اور تقدیر پر ایمان
- اگر کوئی ان بنیادی اعتقادات میں سے کسی ایک کا بھی انکار کرتا ہے، تو وہ اسلام کی

رو سے "کفر" کا مرتکب ہوتا ہے۔ چنانچہ حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ نے فرمایا:
"ایمان کا تجزیہ ممکن نہیں، بعض احکام کا انکار کرنے والا بھی کافر مطلق ہوگا۔"

کفر کی مختلف اقسام

1. ناشکری:

کبھی کبھار "کفر" کا مطلب ناشکری بھی ہوتا ہے، جیسے کہ قرآن میں ذکر ہے:

"لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَأَزِيدَنَّكُمْ وَلَئِنْ كَفَرْتُمْ إِنَّ عَذَابِي

لَشَدِيدٌ" (۱)

(اگر تم شکر کرو گے تو میں تمہیں مزید دوں گا، اور اگر ناشکری کرو گے تو میرا عذاب شدید ہوگا۔)

2. انکارِ حق:

کفر کا سب سے سنگین درجہ وہ ہے جب کوئی بنیادی دینی سچائیوں کو جان بوجھ کر رد کر دے، جیسے توحید، نبوت، یا آخرت کا انکار۔ قرآن میں ارشاد ہوتا ہے:

"وَهُمْ بِالْآخِرَةِ هُمْ كَافِرُونَ" (۲)

(اور وہ آخرت کے منکر ہیں۔)

3. چھپانا یا دبانہ:

عربی میں "کفر" کا مطلب کسی چیز کو چھپانا بھی ہے، جیسے:

رات کو "کافر" کہا جاتا ہے کیونکہ وہ چیزوں کو ڈھانپ لیتی ہے۔

کسان کو "کافر" کہا جاتا ہے کیونکہ وہ زمین میں بیج چھپاتا ہے۔ (۳)

(۱) سورة ابراهيم: 7-

(۲) سورة النحل: 22-

(۳) مفردات القرآن، جلد 2، ص 559-

یہ تمام معانی اس بات کو واضح کرتے ہیں کہ ”کفر“ محض ایک وضاحتی اصطلاح ہے جو کسی چیز کے انکار یا اسے چھپانے پر دلالت کرتی ہے۔

کافر کون ہوتا ہے؟

اسلامی اصطلاح میں ”کافر“ وہ شخص ہے جو اسلام کے بنیادی عقائد کو تسلیم نہیں کرتا۔ یہ انکار مختلف صورتوں میں ہو سکتا ہے:

1. کھلا انکار: کسی اسلامی عقیدے کو صریح طور پر مسترد کر دینا۔
2. الحاد: اللہ کے وجود کا سرے سے انکار کرنا۔
3. تکبر یا نفرت کی بنا پر انکار: جیسے ابو جہل، جس نے اسلام کو برحق جاننے کے باوجود رد کر دیا۔

4. گمراہی: جیسے میلہ کذاب، جس نے جھوٹی نبوت کا دعویٰ کیا۔
 5. اہل کتاب: قرآن میں یہود و نصاریٰ کے لیے بھی ”کافر“ کا لفظ آیا ہے، کیونکہ وہ حضرت محمد ﷺ کی رسالت کو نہیں مانتے۔
- امام محمد (رحمہ اللہ) فرماتے ہیں:

من أنكر شيئاً من شرائع الإسلام فقد أبطل قول لا إله

إلا الله۔ (۱)

(جو شخص اسلام کے کسی بھی حکم کا انکار کرے، وہ اپنے کلمہ ”لا إله إلا الله“ کو باطل کر دیتا ہے۔)

”کیا“ کافر“ کا لفظ توہین آمیز ہے؟

یہ کہنا کہ ”کافر“ کا مطلب کسی کی توہین کرنا ہے، ایک غلط فہمی ہے۔ قرآن میں بار بار اس اصطلاح کا استعمال وضاحتی طور پر ہوا ہے، نہ کہ کسی کو برا بھلا کہنے کے لیے۔ یہ قابل غور ہے کہ مکہ کے مشرکین، جنہیں قرآن میں کافر کہا گیا، نے اس پر کبھی اعتراض نہیں کیا، بلکہ خود بھی اپنے کفر کا اعتراف کیا، جیسا کہ قرآن میں ہے:

”قَالُوا إِنَّا كَافِرُونَ بِمَا أُرْسِلْتُمْ بِهِ“ (۱)

(انہوں نے کہا: ہم اُس چیز کا انکار کرتے ہیں جو تمہارے ساتھ بھیجی گئی ہے۔) یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ ”کافر“ کا استعمال توہین کے لیے نہیں بلکہ ایک عقائدی حقیقت کے بیان کے لیے کیا جاتا ہے۔

دیگر مذاہب میں اس کی مثالیں

مختلف مذاہب میں غیر ماننے والوں کے لیے مخصوص اصطلاحات استعمال ہوتی رہی ہیں:

عیسائیت: 'Infidel' (بے دین) جیسے الفاظ غیر عیسائیوں کے لیے استعمال کیے جاتے ہیں۔

ہندومت: پلچھ (ناپاک) جیسے الفاظ غیر ہندوؤں کے لیے توہین آمیز سمجھے جاتے ہیں۔

اسلام: ”کافر“ ایک غیر جانبدار اصطلاح ہے، جو کسی کی ناپاکی یا کم تری پر دلالت نہیں کرتی، بلکہ صرف ایک عقیدے کے انکار کو ظاہر کرتی ہے۔

کافر کے لفظ کے غلط استعمال سے اجتناب

قرآن میں ”کفر“ کا ذکر تقریباً 494 مرتبہ آیا ہے، اور اس کا استعمال محتاط طریقے سے ہونا چاہیے۔

”ولو قال لذی یا کافر! یا اثم ان شق علیہ“ (۱)

(اگر کوئی غیر مسلم کو اے کافر کہہ کر تکلیف دے تو یہ گناہ ہے۔)

نتیجہ: سمجھ بوجھ اور اعتدال کی راہ

اسلام میں ”کافر“ کی اصطلاح کسی کی تذلیل کے لیے نہیں بلکہ ایک عقائدی وضاحت کے طور پر استعمال کی جاتی ہے۔ اس کا مطلب کسی کو گالی دینا یا کمتر سمجھنا نہیں، بلکہ یہ محض ایک حقیقت کا بیان ہے کہ کون اسلام کو قبول کرتا ہے اور کون نہیں۔ لہذا، یہ اعتراض سراسر غلط فہمی پر مبنی ہے اور اس کی بنیاد ”کفر“ کے مفہوم کو نہ سمجھنے پر ہے۔ مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ اس اصطلاح کو حکمت اور اعتدال کے ساتھ استعمال کریں، تاکہ غلط فہمیاں دور ہوں اور معاشرتی ہم آہنگی برقرار رہے۔

اعتراض نمبر 15: اللہ کو کسی کی عبادت کی ضرورت کیوں ہے؟

جواب: یہ اعتراض زیادہ تر اُن لوگوں کی طرف سے سامنے آتا ہے جو مذہبی عقائد پر یقین نہیں رکھتے یا یہ تصور کرتے ہیں کہ عبادت کا مطلب اللہ کی کسی کمی یا ضرورت کو پورا کرنا ہے۔ اس کا جواب دینا ایک فکری طریقے سے ضروری ہے تاکہ بات غیر مذہبی ذہن کو بھی سمجھ میں آئے۔

1. عبادت اللہ کی ضرورت نہیں بلکہ انسان کی ضرورت ہے:

یہ سمجھنا ضروری ہے کہ اگر اللہ موجود ہے تو وہ لازماً مکمل اور بے عیب ہوگا۔ ایک مکمل ہستی کو کسی بھی چیز کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اگر خدا کسی چیز کا محتاج ہو تو وہ خدا کہلانے کا اہل نہیں رہتا۔

عبادت دراصل مخلوق کے فائدے کے لیے ہے، نہ کہ خالق کے لیے۔ یہ ایک تربیتی عمل ہے جس سے انسان کی شخصیت میں مثبت تبدیلی آتی ہے۔ فرض کریں کہ ایک استاد اپنے شاگرد کو مشق کرنے کا حکم دیتا ہے۔ استاد کا مقصد شاگرد کو بہتر بنانا ہے، نہ کہ اپنی کسی ذاتی ضرورت کو پورا کرنا۔ اسی طرح، عبادت انسان کی ذہنی، اخلاقی، اور روحانی تربیت کا ذریعہ ہے۔

2. عبادت کا انسان کی نفسیات پر اثر:

انسانی نفسیات یہ تقاضا کرتی ہے کہ وہ کسی مقصد کے تحت زندگی گزارے۔ عبادت انسان کو مقصد فراہم کرتی ہے، اسے اپنی تخلیق کے بارے میں غور و فکر کرنے پر مجبور کرتی ہے، اور اسے اپنے اعمال کے نتائج کی ذمہ داری اٹھانے کا احساس دلاتی ہے۔

شکرگزاری کا جذبہ:

اگر کوئی شخص کسی کی مدد یا احسان کا شکر گزار نہ ہو تو وہ اخلاقی طور پر کمتر سمجھا جاتا ہے۔ عبادت شکرگزاری کی اعلیٰ ترین شکل ہے، جس سے انسان عاجزی اور محبت کے جذبات پیدا کرتا ہے۔

3. عبادت، اخلاقیات اور سماج:

عبادت کا اصل مقصد انسان کو اخلاقی طور پر مضبوط بنانا ہے۔ یہ انسان کو ظلم، بدعنوانی، اور خود غرضی سے دور رکھتی ہے۔ عبادت انسان کو اپنی حدود کا احساس دلاتی

ہے اور اسے دوسروں کے حقوق کا خیال رکھنے کی ترغیب دیتی ہے۔

مثال: ایک انسان جو روزانہ عبادت کرتا ہے، وہ اپنے اندر نظم و ضبط پیدا کرتا ہے۔ وہ اپنے اعمال کا جواب دہ ہونے کا احساس رکھتا ہے، چاہے کوئی اسے دیکھ رہا ہو یا نہ ہو۔ اس سے وہ اپنے معاملات میں ایماندار اور دیانت دار رہتا ہے۔ عبادت صرف انفرادی عمل نہیں ہے؛ یہ سماجی پہلو بھی رکھتی ہے۔ مثال کے طور پر، اجتماعی عبادت لوگوں کو ایک دوسرے کے قریب لاتی ہے اور ان کے درمیان اخوت اور اتحاد پیدا کرتی ہے۔

4. عبادت انسان کو مغرور ہونے سے بچاتی ہے:

انسان جب اپنی کامیابیوں اور طاقت پر غرور کرنے لگتا ہے تو وہ اپنی حدود بھول جاتا ہے اور دوسروں پر ظلم کرنے لگتا ہے۔ عبادت انسان کو اپنی حیثیت کا احساس دلاتی ہے اور اسے یاد دلاتی ہے کہ وہ ایک محدود اور محتاج مخلوق ہے۔ جب ایک انسان عبادت کرتا ہے، تو وہ اپنی ذات کو ایک بڑی حقیقت کے سامنے جھکا کر عاجزی سیکھتا ہے۔ یہ عاجزی اسے بہتر انسان بننے میں مدد دیتی ہے، جو معاشرتی اور اخلاقی لحاظ سے اہم ہے۔

5. عبادت کا عملی پہلو:

عبادت محض ایک رسمی عمل نہیں ہے، بلکہ اس کے عملی اثرات انسانی زندگی پر نمایاں ہوتے ہیں۔ سائنس بھی اس بات کی تصدیق کرتی ہے کہ غور و فکر، دعا، اور عبادت جیسی سرگرمیاں ذہنی سکون اور دماغی صحت کو بہتر بناتی ہیں۔ وہ لوگ جو روزانہ مراقبہ یا دعا کرتے ہیں، وہ زیادہ پرسکون اور ذہنی طور پر مضبوط ہوتے ہیں۔ ان کے فیصلے بہتر ہوتے ہیں اور وہ تناؤ کو بہتر طریقے سے سنبھال سکتے ہیں۔

خلاصہ: اللہ کو کسی کی عبادت کی ضرورت نہیں ہے۔ عبادت کا مقصد انسان کی روحانی، ذہنی، اور اخلاقی تربیت ہے۔ یہ انسان کو بہتر بناتی ہے، اس کے رویے میں عاجزی پیدا کرتی ہے، اور اسے اپنی زندگی کو مقصد کے ساتھ گزارنے کی ترغیب دیتی ہے۔ عبادت کا حکم دینا اللہ کی کسی ضرورت کی نشاندہی نہیں کرتا، بلکہ انسان کے فائدے کے لیے ہے، تاکہ وہ اپنی ذات کو سنوار سکے اور معاشرت میں مثبت کردار ادا کر سکے۔

آخری بات:

عبادت کو اللہ کی ضرورت سمجھنے کے بجائے، اسے اپنی ذات کی بہتری کا ذریعہ سمجھا جائے۔ یہ اعتراض اس وقت پیدا ہوتا ہے جب خدا کی صفات کو انسانی پیمانوں پر پرکھا جاتا ہے۔ عبادت انسان کے فائدے کے لیے ہے، اور یہ کسی بھی کائناتی خالق کی عظمت کو ثابت کرنے کی ضرورت نہیں رکھتی، کیونکہ ایک کامل خالق کو کسی مخلوق سے کچھ درکار نہیں ہوتا۔

اعتراض نمبر 16: اللہ کی عبادت صرف انسانوں سے کیوں؟

اللہ نے انسانوں کو عبادت کے لیے کیوں منتخب کیا؟ کیا یہ ظاہر نہیں کرتا کہ اللہ نے انسانوں کو کسی خاص ترجیح کی بنیاد پر بنایا ہے؟ اگر اللہ تمام مخلوقات کا خالق ہے تو پھر صرف انسان ہی عبادت کے پابند کیوں ہیں؟

جواب: یہ اعتراض اللہ کے عبادت کے حکم کو ایک خاص انسانی ترجیح یا امتیاز کے طور پر دیکھتا ہے، لیکن اس مسئلے کو سمجھنے کے لیے ہمیں عبادت، انسان کی حیثیت، اور دیگر مخلوقات کے ساتھ اس کے تعلق کو گہرائی سے دیکھنا ہوگا۔

1. انسان کی فطرت اور اختیار کی انفرادیت:

اللہ نے انسان کو ایک خاص حیثیت اور ذمہ داری دی ہے، جو کہ اس کی تخلیق کی نوعیت اور اس کے شعور پر مبنی ہے۔

اختیار (Free Will):

انسان دیگر مخلوقات کے برعکس شعور (consciousness) اور اختیار رکھتا ہے۔ اس کے پاس نیکی یا برائی کا انتخاب کرنے کی آزادی ہے۔ عبادت کا حقیقی مطلب یہ ہے کہ انسان اپنی مرضی اور اختیار کے ساتھ اللہ کے سامنے جھکے اور اس کی فرمانبرداری کرے۔ اگر انسان کو اختیار نہ دیا جاتا، تو عبادت صرف ایک بے شعور عمل ہوتی، جو اللہ کی حکمت اور انسان کی تخلیق کے مقصد کو پورا نہ کرتی۔

شعور اور علم:

انسان کو دیگر مخلوقات پر اس کی علمی قابلیت اور شعور کی وجہ سے فوقیت دی گئی ہے:

"وَعَلَّمَ آدَمَ الْأَسْمَاءَ كُلَّهَا" (۱)

ترجمہ: "اور اللہ نے آدم کو تمام چیزوں کے نام سکھا دیے۔"

یہ علم اور شعور انسان کو باقی مخلوقات سے ممتاز کرتا ہے اور اسے اپنی تخلیق کے مقصد کو پہچاننے کے قابل بناتا ہے۔

2. دیگر مخلوقات کی عبادت کی نوعیت:

یہ ضروری ہے کہ ہم عبادت کے مفہوم کو سمجھیں۔ عبادت صرف رسمی اعمال (نماز،

روزہ، وغیرہ) تک محدود نہیں، بلکہ یہ ہر مخلوق کا اپنے تخلیق کردہ مقصد کو پورا کرنا ہے۔

مکمل فرمانبرداری:

دیگر مخلوقات اپنی جبلت کے مطابق اللہ کی عبادت کرتی ہیں۔ سورج، چاند، درخت، اور تمام کائناتی نظام اللہ کی مقرر کردہ حدود میں کام کرتے ہیں، جو کہ ان کی عبادت ہے۔

"وَإِنْ مِّن شَيْءٍ إِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهِ وَلَكِنْ لَا تَفْقَهُونَ تَسْبِيحَهُمْ" (۱)

ترجمہ: "اور کوئی بھی چیز ایسی نہیں جو اس کی حمد کے ساتھ تسبیح نہ کرتی ہو، لیکن تم ان کی تسبیح کو سمجھ نہیں سکتے۔"

اختیار کی غیر موجودگی:

دیگر مخلوقات کی عبادت ان کے فطری قوانین کے ذریعے ہوتی ہے۔ چونکہ وہ اختیار نہیں رکھتیں، اس لیے ان کی عبادت شعوری نہیں بلکہ طبعی ہے۔
3. انسان کی عبادت شعوری ہوتی ہے:

انسان کو اللہ نے عبادت کا حکم اس لیے دیا کیونکہ انسان کی عبادت شعوری، ارادی، اور محبت پر مبنی ہوتی ہے۔

ارادی عبادت:

انسان اپنی مرضی سے اللہ کے احکامات مانتا ہے، جو اس کی عاجزی اور اللہ سے محبت کو ظاہر کرتا ہے۔ یہ عبادت کا سب سے اعلیٰ درجہ ہے، جو صرف ایک شعوری مخلوق ہی انجام دے سکتی ہے۔

ذمہ داری کا بوجھ:

انسان کو زمین پر ایک خلیفہ بنایا گیا ہے، جس کا مطلب ہے کہ اسے زمین پر انصاف اور اللہ کے قوانین کو نافذ کرنے کی ذمہ داری دی گئی ہے:

"إِنِّي جَاعِلٌ فِي الْأَرْضِ خَلِيفَةً" (۱)

ترجمہ: ”بے شک میں زمین میں ایک خلیفہ بنانے والا ہوں۔“

یہ ذمہ داری انسان کی عبادت کے حکم کی وضاحت کرتی ہے، کیونکہ ایک خلیفہ کو اللہ کی حکمت اور عدل کے مطابق عمل کرنا ہوتا ہے۔

خلاصہ: اللہ نے عبادت کا حکم انسان کو اس کے شعور، اختیار، اور زمین پر اس کی ذمہ داری کے پیش نظر دیا ہے۔ دیگر مخلوقات اپنی عبادت کو فطری طور پر انجام دیتی ہیں، لیکن انسان کی عبادت شعوری، ارادی، اور محبت پر مبنی ہے، جو اسے اللہ کے قریب کرتی ہے۔ عبادت اللہ کی کسی ضرورت کے لیے نہیں، بلکہ انسان کی اپنی روحانی، اخلاقی، اور سماجی ترقی کے لیے ضروری ہے۔

اعتراض نمبر 17: اگر انسان کو نیک اور بد میں اختیار دینا تھا،

تو اللہ نے فرشتوں (ملکیت) اور حیوانات (بہیمیت) کی

طرح کیوں نہیں پیدا کیا؟ کیوں ایک درمیانی مخلوق بنائی

جو کشمکش میں مبتلا ہے؟ کیا یہ ظلم نہیں؟

جواب: یہ اعتراض انسان کی حقیقت اور اس کے مقام کے ناقص فہم پر مبنی

ہے۔ انسان کی فطرت، ملکیت (فرشتوں کی صفات) اور بہیمیت (حیوانی جبلت) کے فرق کو سمجھ کر ہی اس سوال کا درست تجزیہ کیا جاسکتا ہے۔ اسی فرق کے ذریعے اس اعتراض کا فلسفیانہ اور عقلی جواب پیش کیا جاسکتا ہے۔

1. تین اقسام کی مخلوقات اور ان کی حقیقت

ملائکہ (فرشتے)۔ محض خیر اور اطاعت

فرشتے محض نیکی پر مجبور ہیں، ان میں کسی بھی قسم کی سرکشی یا آزمائش کا عنصر نہیں۔ وہ اللہ کے حکم کے پابند ہیں اور کبھی خلاف ورزی نہیں کرتے۔ چونکہ وہ مکمل خیر کے مظہر ہیں، اس لیے ان کا کسی جزا و سزا سے تعلق نہیں۔

بہائم (حیوانات)۔ جبلی تقاضوں کے تابع

حیوانات کے اندر عقل، شعور، اور اختیار نہیں، بلکہ صرف جبلی خواہشات ہوتی ہیں۔ ان کے تمام اعمال بقاء، غذا، اور تناسل کے گرد گھومتے ہیں، اور وہ اخلاقی یا غیر اخلاقی ہونے کی قابلیت نہیں رکھتے۔ چونکہ وہ فطری جبلت کے تحت عمل کرتے ہیں، اس لیے ان کے اعمال پر کسی جزا و سزا کا سوال نہیں اٹھتا۔

انسان۔ دونوں کا امتزاج اور مکلفیت

انسان میں ملکیت اور بہیمیت دونوں موجود ہیں، اور یہی اسے اشرف المخلوقات بناتا ہے۔

ملکیت کی خصوصیات: عقل، شعور، خیر کی طرف رجحان، اور اللہ کی معرفت۔
بہیمیت کی خصوصیات: جبلی خواہشات، حیوانی تقاضے، اور دنیاوی لذات کی طرف رغبت۔

یہ انسان ہی ہے جو ان دونوں قوتوں کے درمیان کشمکش میں مبتلا ہوتا ہے، اور یہی اس کا امتحان ہے۔

2. انسان کو امتحان کے لیے تخلیق کرنا ظلم نہیں، بلکہ شرف ہے اگر انسان کو صرف فرشتوں کی طرح بنایا جاتا تو اس کا ہر عمل مجبورانہ اطاعت ہوتا، اور اس کے لیے نیکی کا کوئی اجر نہ ہوتا۔ اس میں خیر و شر کا شعور پیدا ہی نہ ہوتا، کیونکہ وہ ہمیشہ صحیح راستے پر چلنے کے لیے مجبور ہوتا۔

اگر انسان کو محض حیوان بنایا جاتا تو وہ بھی صرف جسمانی تقاضوں پر عمل کرتا، بغیر کسی عقل، شعور، یا اخلاقی احساس کے۔ اس میں نہ اچھائی کا شعور ہوتا، نہ برائی کا، کیونکہ وہ صرف اپنی ضروریات پوری کرنے میں مصروف رہتا۔

نتیجہ: وہ کسی جزا و سزا کے قابل نہ ہوتا، کیونکہ اس کے اندر خیر و شر میں انتخاب کی قوت ہی نہ ہوتی۔

انسان کو ان دونوں کے درمیان بنایا گیا، کیونکہ وہ فرشتوں کی طرح نیکی کی پہچان رکھتا ہے، لیکن اس پر مجبور نہیں۔ وہ حیوانات کی طرح جسمانی خواہشات رکھتا ہے، لیکن ان پر قابو پانے کی صلاحیت بھی رکھتا ہے۔

یہی اعتدال اور کشمکش، انسان کو عظیم بناتی ہے، کیونکہ وہ اپنی آزمائش کے ذریعے اپنے درجے کا تعین کرتا ہے۔ لہذا، انسان کو فرشتے یا حیوان بنانے کے بجائے، ایک درمیانی مخلوق بنانا ہی اصل حکمت ہے۔

3. ملکیت اور بہیمیت میں توازن ہی اصل مقصد ہے

اگر انسان صرف بہیمیت کی طرف جھک جائے، تو وہ حیوانات سے بھی بدتر ہو جاتا ہے۔ اگر وہ صرف ملکیت کی طرف جھک جائے، تو وہ دنیا کے تقاضوں سے کٹ کر

راہبیت میں پڑ جاتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ اسلام انسان کو ان دونوں کے درمیان توازن قائم رکھنے کی تلقین کرتا ہے۔ یہی توازن اسے ایک کامیاب اور مکمل انسان بناتا ہے۔ وہ اپنی جبلّی خواہشات کو شرعی دائرے میں رکھتے ہوئے ان سے لطف اندوز ہو سکتا ہے۔ وہ عقل اور وحی کی روشنی میں اپنی روحانی ترقی بھی کر سکتا ہے۔

4. آزمائش، ذمہ داری، اور انصاف

یہ عدل کا تقاضا ہے کہ جو شخص اپنی عقل اور اختیار کو صحیح استعمال کرے، وہ کامیاب ہو۔ جو شخص اپنی بہیمیت کے ہاتھوں مغلوب ہو جائے، وہ اپنے عمل کا ذمہ دار ہو۔

اللہ نے انسان کو علم اور رہنمائی دی

اگر کوئی شخص ہدایت کے بعد بھی برائی کا انتخاب کرتا ہے، تو وہ خود اپنے انجام کا ذمہ دار ہے۔ اس میں کوئی ظلم نہیں، کیونکہ اس نے خود اپنا راستہ چُنا۔ وہی حقیقت ہے جو قرآن میں بیان کی گئی:

”ہم نے انسان کو دونوں راستے دکھا دیے، اب وہ چاہے شکر گزار بنے یا ناشکرا“ (۱)

نتیجہ: یہ اعتراف کہ ”انسان کو صرف فرشتوں یا حیوانوں کی طرح کیوں نہیں بنایا گیا؟“ فہم کی کمی پر مبنی ہے۔ فرشتے بے اختیار نیک ہیں، حیوان بے اختیار جبلّی ہیں، لیکن انسان صاحب اختیار اور مکلف ہے۔

اعتراض نمبر 18: اگر اللہ نے سب کو ایک جیسا پیدا کیا ہوتا، سب کو ایک جیسا ذہن دیا ہوتا، سب کو برابر کے مواقع دیے ہوتے، تو امتحان واقعی عادلانہ ہوتا۔ لیکن کوئی ذہین پیدا ہوتا ہے، کوئی نادان، کوئی امیر، کوئی غریب، تو پھر یہ انصاف کیسے ہے؟

جواب: یہ اعتراض بنیادی طور پر عدالتِ الہی اور انسانی تقدیر کے مسئلے پر مبنی ہے۔ اعتراض کرنے والے کا موقف یہ ہے کہ چونکہ انسانوں کے حالات اور صلاحیتوں میں فرق پایا جاتا ہے، اس لیے امتحان میں سب کے لیے یکساں مواقع فراہم نہیں کیے گئے، جو بظاہر انصاف کے خلاف معلوم ہوتا ہے۔ لیکن جب اس مسئلے کا عقلی، منطقی، اور اسلامی اصولوں کی روشنی میں تجزیہ کیا جائے، تو حقیقت بالکل برعکس نظر آتی ہے۔

1. امتحان ہمیشہ حالات کے مطابق ہوتا ہے، نہ کہ یکساں معیار پر

اللہ نے ہر انسان کا امتحان اس کے حالات، صلاحیتوں، اور وسائل کے مطابق رکھا ہے۔

اگر کسی کو زیادہ نعمتیں دی گئی ہیں، تو اس کا امتحان یہ ہے کہ وہ انہیں کس طرح استعمال کرتا ہے۔

اگر کسی کو کم وسائل دیے گئے ہیں، تو اس کا امتحان اس کی صبر، محنت، اور حق پسندی پر ہوگا۔ ہر شخص کے لیے آزمائش کا دائرہ اس کی استطاعت کے مطابق مقرر کیا گیا ہے۔ قرآن میں واضح طور پر کہا گیا ہے:

"لَا يُكَلِّفُ اللَّهُ نَفْسًا إِلَّا وُسْعَهَا" (۱)

”اللہ کسی جان کو اس کی طاقت سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالتا۔“
 لہذا کوئی بھی شخص ایسا امتحان نہیں دے رہا جو اس کی استطاعت سے باہر ہو۔
 یہ اصل انصاف ہے، کیونکہ یکساں امتحان غیر منصفانہ ہوتا۔
 2. اگر سب کے حالات برابر ہوتے، تو امتحان کی اصل روح ختم ہو جاتی
 اگر سب کو یکساں ذہانت، یکساں مال و دولت، اور یکساں مواقع دیے جاتے، تو
 پھر امتحان کا مقصد ہی ختم ہو جاتا، کیونکہ:
 سب ایک جیسے فیصلے کرتے سب ایک ہی راستے پر چلتے،
 کسی کے پاس کوئی چیلنج نہ ہوتا، جسے وہ اپنی محنت، عقل، یا صبر سے حل کر سکتا۔
 یہ ایک خود کار نظام کی طرح ہو جاتا، جہاں ہر شخص پہلے سے طے شدہ انداز میں
 چلتا۔ تب نہ کوئی اخلاقی ترقی ہوتی، نہ کوئی روحانی ترقی، اور نہ ہی کسی کی اپنی ذاتی جدوجہد
 کی کوئی اہمیت باقی رہتی۔
 اللہ نے ہر شخص کو مختلف حالات میں ڈال کر اسے یہ موقع دیا ہے کہ وہ اپنی عقل
 اور اختیار کے مطابق بہترین راستے کا انتخاب کرے۔
 3. برتری کا معیار مال، حیثیت یا ذہانت نہیں، بلکہ تقویٰ ہے
 انسانوں کے درمیان جو ظاہری فرق نظر آتے ہیں، وہ اللہ کے ہاں برتری کا معیار
 نہیں ہیں۔ کوئی امیر ہے یا غریب، کوئی ذیین ہے یا کم فہم، کوئی طاقتور ہے یا کمزور، یہ
 سب چیزیں اللہ کے ہاں کامیابی کا معیار نہیں۔
 قرآن میں کہا گیا:

”إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ“ (۱)

”تم میں سب سے زیادہ معزز وہ ہے جو سب سے زیادہ متقی ہے۔“
یہی حقیقی انصاف ہے کہ کامیابی انسان کے اختیار اور نیت پر رکھی گئی ہے، نہ کہ
پیدائشی حالات پر۔

4 مختلف حالات میں پیدا ہونا کسی کے حق میں نقصان نہیں، بلکہ حکمت ہے اگر غور
کیا جائے، تو دنیا کے مختلف حالات دراصل انسانی ترقی کے مواقع فراہم کرتے ہیں۔
اگر سب ایک جیسے ہوتے، تو کوئی دوسروں کے لیے آزمائش یا مددگار نہ بنتا۔
دنیا میں متنوع حالات ہی وہ بنیاد ہیں جن کے ذریعے نیکی، قربانی، محنت، صبر، اور
شکر جیسے اوصاف پیدا ہوتے ہیں۔

اگر دنیا میں کوئی غریب نہ ہوتا، تو صدقہ و خیرات کا تصور ختم ہو جاتا۔
اگر دنیا میں کوئی بیمار نہ ہوتا، تو رحم، ہمدردی، اور دعاؤں کا مفہوم ختم ہو جاتا۔ اگر
دنیا میں سب یکساں ذہین ہوتے، تو مختلف شعبوں میں مہارت رکھنے والے افراد کی
ضرورت نہ رہتی۔ یہی وہ تنوع ہے جو دنیا کے سماجی نظام کو متوازن رکھتا ہے، اور ہر شخص
کو کسی نہ کسی آزمائش کے ذریعے اپنی حقیقت کو ثابت کرنے کا موقع دیتا ہے۔

5 کسی کو زیادہ دینا کسی کو کم دینا عدل کے خلاف نہیں، بلکہ انصاف کا تقاضا ہے
یہ اعتراض اکثر اس غلط فہمی پر مبنی ہوتا ہے کہ عدل اور مساوات ایک ہی چیز ہیں۔
مساوات (Equality): سب کو بالکل برابر مواقع دینا، قطع نظر اس کے کہ ان
کی ضروریات اور حالات کیا ہیں۔

عدل (Justice): ہر شخص کو اس کی صلاحیت، حالات، اور ضروریات کے
مطابق مواقع دینا۔

اللہ کا نظام عدل پر مبنی ہے، نہ کہ یکساں مواقع پر۔

اگر ایک مزدور سے کسی ڈاکٹر جتنے علمی سوالات پوچھے جائیں، تو یہ انصاف نہیں۔
اگر ایک بچے پر کسی بالغ انسان جتنی ذمہ داری ڈالی جائے، تو یہ ظلم ہوگا۔
یہی اصول دنیا میں لاگو ہوتا ہے کہ ہر شخص کا امتحان اس کے حالات کے مطابق
ہے، اور یہ فرق ظلم نہیں، بلکہ عدل کی بہترین مثال ہے۔
نتیجہ: یہ اعتراض حقیقت میں عدل اور مساوات کے فرق کو نظر انداز
کرتا ہے۔

ہر شخص کو اس کی صلاحیت، حیثیت، اور حالات کے مطابق امتحان دیا گیا ہے، نہ کہ
سب کو ایک جیسا۔

اگر سب ایک جیسے ہوتے، تو آزمائش کا مقصد ہی ختم ہو جاتا، اور زندگی میں کوئی
جدوجہد باقی نہ رہتی۔

اصل کامیابی ذہانت یا دولت میں نہیں، بلکہ نیک نیتی اور تقویٰ میں ہے، جو ہر شخص
کے لیے یکساں طور پر ممکن ہے۔

دنیا کی تنوع اور مختلف حالات دراصل زندگی کے توازن اور انسانی ترقی کا ذریعہ
ہیں، نہ کہ نا انصافی۔

عدل کا مطلب سب کو برابر مواقع دینا نہیں، بلکہ ہر شخص کو اس کے مطابق وہ موقع
دینا ہے جس میں وہ آزمائش میں پورا اتر سکے۔

لہذا، یہ اعتراض حقیقی انصاف کی حکمت کو نظر انداز کرتا ہے، کیونکہ انسان کی
پیدائش کا مقصد یہ نہیں کہ سب ایک جیسے ہوں، بلکہ یہ ہے کہ ہر شخص اپنے حالات میں
بہترین راستہ اختیار کرے اور اپنی آزمائش میں کامیاب ہو۔

اعتراض نمبر 19: اگر اللہ کو پہلے سے معلوم ہے کہ کون جنت میں

جائے گا اور کون جہنم میں، تو پھر امتحان کا کیا فائدہ؟ کیا یہ صرف

ایک رسمی کارروائی نہیں؟

جواب: یہ اعتراض علم الہی (Allah's Foreknowledge) اور انسانی اختیار (Free Will) کے باہمی تعلق سے متعلق ہے۔ اعتراض کرنے والے کا موقف یہ ہے کہ اگر اللہ کو پہلے سے معلوم ہے کہ کون جنت میں جائے گا اور کون جہنم میں، تو امتحان بے معنی ہو جاتا ہے۔ لیکن جب اس مسئلے کا عقلی، منطقی، اور اسلامی اصولوں کی روشنی میں تجزیہ کیا جائے، تو اس کی حقیقت واضح ہو جاتی ہے۔

1. علم الہی، جبر (Determinism) نہیں، بلکہ محض آگاہی ہے بعض لوگ علم الہی کو جبری تقدیر (Fatalism) کے مترادف سمجھتے ہیں، جبکہ حقیقت میں یہ دونوں مختلف چیزیں ہیں۔

اللہ کا علم یہ نہیں کہ وہ کسی کو مجبور کر رہا ہے، بلکہ اس کا مطلب ہے کہ وہ پہلے سے جانتا ہے کہ بندہ اپنے اختیار سے کیا فیصلہ کرے گا۔

❑ علم کا ہونا کسی کو مجبور کرنے کے مترادف نہیں ہوتا۔

مثال: ایک استاد اگر کسی طالب علم کی ذہنی سطح اور محنت کو دیکھ کر یہ اندازہ لگا لے کہ وہ امتحان میں ناکام ہوگا، تو یہ کہنا غلط ہوگا کہ استاد کی پیشگوئی کی وجہ سے طالب علم ناکام ہوا۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ استاد کو پہلے سے معلوم تھا کہ وہ طالب علم اپنی کوتاہی کی وجہ سے ناکام ہوگا۔ اسی طرح، اللہ کو پہلے سے معلوم ہے کہ کون کس راستے کو چنے گا، لیکن وہ اس

راستے پر مجبور نہیں کرتا۔

2. علم الہی اور انسانی اختیار میں تضاد نہیں

انسانی عقل محدود ہے، جبکہ اللہ کا علم لامحدود ہے۔

انسان وقت کے دائرے میں قید ہے، جبکہ اللہ ماضی، حال اور مستقبل کو بیک وقت دیکھ سکتا ہے۔

اللہ کے علم کا یہ مطلب نہیں کہ وہ انسان کی آزادی سلب کر لیتا ہے۔

مثال: اگر کسی کے سامنے ایک CCTV کیمرہ لگا ہوا ہو اور وہ کسی شخص کو چوری کرتے ہوئے دیکھے، تو یہ کہنا غلط ہوگا کہ کیمرے نے چوری کروائی۔

کیمرے کا کام محض واقعے کو ریکارڈ کرنا ہے، نہ کہ چوری کروانا۔

بالکل اسی طرح، اللہ کا علم انسان کو مجبور نہیں کرتا، بلکہ وہ پہلے سے جانتا ہے کہ انسان اپنے اختیار سے کیا کرے گا۔

3. امتحان کا مقصد: انصاف اور حجت کا قائم ہونا

اگرچہ اللہ کو ہر چیز کا علم ہے، لیکن امتحان کا مقصد انصاف قائم کرنا اور حجت مکمل کرنا ہے۔

اگر اللہ بغیر امتحان کے جنت اور جہنم کا فیصلہ کر دیتا، تو لوگ اعتراض کرتے کہ ہمیں موقع ہی نہیں دیا گیا۔

اللہ نے دنیا کو ایک آزمائشی میدان بنایا، تاکہ ہر شخص اپنے عمل سے اپنے انجام کا فیصلہ خود کرے۔

اس آزمائش کے ذریعے ہر شخص کے لیے حجت مکمل ہو جاتی ہے کہ وہ کس انجام کا مستحق ہے۔

قرآن میں اللہ فرماتا ہے:

"وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِينَ حَتَّىٰ نَبْعَثَ رَسُولًا" (۱)

"ہم کسی قوم کو عذاب نہیں دیتے جب تک ان کے پاس رسول نہ بھیج دیں۔"
یہ آیت اس حقیقت کو واضح کرتی ہے کہ اللہ بغیر دلیل اور آزمائش کے کسی کو سزا نہیں دیتا۔

4. امتحان کے بغیر جزا و سزا کا تصور ظالمانہ ہوتا

اگر اللہ بغیر امتحان کے لوگوں کو جنت یا جہنم میں ڈال دیتا، تو یہ عدل کے خلاف ہوتا۔

عدل کا تقاضا ہے کہ ہر انسان کو اپنی قابلیت اور عمل کے مطابق جزا یا سزا دی جائے۔

اگر کسی کو موقع دیے بغیر جہنم میں ڈال دیا جائے، تو وہ کہے گا کہ مجھے تو موقع ہی نہیں ملا۔

اللہ کا علم صرف یہ بتاتا ہے کہ بندہ اپنے اختیار سے کون سا راستہ اپنائے گا، لیکن اللہ اسے زبردستی کسی راستے پر نہیں ڈالتا۔

مثال: اگر ایک اسکول کے پرنسپل کو معلوم ہو کہ ایک طالب علم سال بھر محنت نہیں کرے گا اور فیل ہو جائے گا، تو کیا یہ انصاف ہو گا کہ اسے پہلے ہی فیل کر دیا جائے، بغیر امتحان دیے؟ نہیں! بلکہ انصاف کا تقاضا ہے کہ طالب علم کو پورا موقع دیا جائے، تاکہ وہ خود اپنے عمل سے اپنے نتیجے کا فیصلہ کرے۔

5. قرآن وحدیث کی روشنی میں علم الہی اور انسانی اختیار

اسلام نے واضح کیا ہے کہ اللہ کا علم اور انسان کا اختیار دونوں اپنی جگہ درست ہیں۔
قرآن کہتا ہے:

"مَنْ شَاءَ فَلْيُؤْمِنْ وَمَنْ شَاءَ فَلْيُكْفُرْ" (۱)

"جو چاہے ایمان لے آئے، اور جو چاہے کفر کرے۔"
یہ واضح کرتا ہے کہ انسان کو اختیار دیا گیا ہے۔
حدیث میں ہے:

"تمام اعمال کا دار و مدار نیت پر ہے" (۲)

اگر سب کچھ جبری ہوتا، تو نیت کا کوئی مفہوم نہ ہوتا۔
یہ نصوص واضح کرتی ہیں کہ انسان کو مکمل آزادی دی گئی ہے، اور اللہ کا علم صرف اس
آزادی کے نتیجے کو پہلے سے جانتا ہے، نہ کہ اسے جبری بنا دیتا ہے۔
نتیجہ: یہ اعتراف حقیقت میں علم اور اختیار کے باہمی تعلق کو نہ سمجھنے کی وجہ
سے پیدا ہوتا ہے۔

اللہ کا علم کسی کو مجبور نہیں کرتا، بلکہ وہ صرف جانتا ہے کہ کون سا بندہ اپنے اختیار سے کیا
کرے گا۔

امتحان اس لیے ضروری ہے، تا کہ کسی پر ظلم نہ ہو اور ہر شخص کو موقع ملے کہ وہ اپنی
نجات کا فیصلہ خود کرے۔

اگر اللہ بغیر امتحان کے لوگوں کو جنت یا جہنم میں ڈال دیتا، تو یہ عدل کے
خلاف ہوتا۔

(۱) الکہف: ۲۹۔

(۲) بخاری: ۱۔

انسانی اختیار کا مطلب یہ نہیں کہ اللہ کا علم محدود ہو، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کی قدرت اور عدل مکمل اور متوازن ہے۔

لہذا، یہ اعتراض حقیقت میں ایک منطقی مغالطہ ہے، کیونکہ اللہ کا علم کسی کو مجبور نہیں کرتا، بلکہ انسان کو اختیار کے ساتھ مہلت دیتا ہے تاکہ وہ اپنے عمل کی بنیاد پر اپنا انجام خود متعین کرے۔

اعتراض نمبر 20: خدا نے ہمیں زندگی دی، لیکن ہم سے یہ پوچھا ہی

نہیں گیا کہ ہمیں پیدا ہونا ہے یا نہیں۔ کیا یہ زبردستی نہیں؟ کیا کسی کو

بغیر اجازت دنیا میں لانا ظلم نہیں؟

جواب: یہ اعتراض زندگی، اختیار، اور عدل الہی کے فلسفے پر مبنی ہے۔ اعتراض کرنے والے کا موقف یہ ہے کہ ہمیں پیدا ہونے کا اختیار نہیں دیا گیا، لہذا یہ زبردستی ہے اور اس میں انصاف نظر نہیں آتا۔ لیکن جب اس مسئلے کا عقلی، منطقی، اور اسلامی اصولوں کی روشنی میں تجزیہ کیا جائے، تو اس کی حقیقت واضح ہو جاتی ہے۔

1. اگر عدم میں ہوتے، تو یہ سوال ہی ممکن نہ ہوتا

یہ اعتراض تبھی ممکن ہے جب انسان کو شعور اور حیات حاصل ہو، ورنہ ”نہ ہونے“ کی حالت میں یہ سوال بھی پیدا نہ ہوتا۔

”پیدا نہ ہونے“ کا کوئی شعور نہیں ہوتا، اس لیے یہ کہنا کہ ہمیں اجازت لیے بغیر کیوں پیدا کیا گیا، خود ایک بے معنی سوال ہے۔

اگر کسی کو زندگی ملی ہی نہ ہوتی، تو وہ یہ اعتراض بھی نہ کر سکتا، کیونکہ وہ موجود ہی نہ ہوتا۔

لہذا، پہلے وجود میں آنا ضروری تھا تا کہ شعور حاصل ہو اور سوال اٹھایا جاسکے۔
یہی وجہ ہے کہ زندگی دینے کا فیصلہ اللہ کا تھا، کیونکہ ”عدم“ میں رہنے والے کسی بھی
مخلوق سے اجازت لینا ممکن ہی نہیں۔

2. زندگی دینا احسان ہے، نہ کہ ظلم

اسلامی عقیدے کے مطابق زندگی ایک نعمت اور موقع ہے، نہ کہ کوئی جبر یا سزا۔
اگر کسی کو قیمتی چیز ملے اور وہ اس کا درست استعمال نہ کرے، تو کیا یہ دینے والے
کی غلطی ہوگی؟

زندگی ایک موقع ہے کہ انسان اپنی صلاحیتوں کو پہچانے، حق کو قبول کرے، اور
ابدی کامیابی حاصل کرے۔

جو لوگ زندگی کو بوجھ سمجھتے ہیں، وہ درحقیقت اس کا درست مقصد نہیں سمجھے۔

قرآن میں اللہ فرماتا ہے:

”الَّذِي خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيَاةَ لِيَبْلُوَكُمْ أَيُّكُمْ أَحْسَنُ
عَمَلًا“ (۱)

”جس نے موت اور زندگی کو پیدا کیا تا کہ وہ تمہیں آزمائے کہ تم میں سے بہترین
عمل کون کرتا ہے۔“

یہ واضح کرتا ہے کہ زندگی محض ایک آزمائش ہے، جو ہمیں اللہ کی رحمت یا عذاب کا
مستحق بننے کا موقع دیتی ہے۔

3. اگر ہم سے پیدا ہونے سے پہلے پوچھا جاتا، تو کیا ہوتا؟

کچھ لوگ یہ تصور کرتے ہیں کہ اگر ہمیں پیدا ہونے سے پہلے اجازت دی جاتی، تو

شاید ہم انکار کر دیتے۔ لیکن یہ سوچ حقیقت میں منطقی نہیں کیونکہ:
جو چیز عدم میں ہو، اس کے پاس سوچنے اور فیصلہ کرنے کی صلاحیت ہی نہیں
ہو سکتی۔

اگر کسی سے ”پیدا ہونے سے پہلے“ پوچھا جاتا، تو وہ یہ فیصلہ ہی نہیں کر سکتا تھا، کیونکہ
وہ موجود ہی نہیں تھا۔

لہذا، یہ ضروری تھا کہ پہلے زندگی دی جائے، پھر اختیار دیا جائے کہ وہ کیسا راستہ
اپناتا ہے۔

4. انسان کے وجود میں آنے سے پہلے بھی ایک عہد لیا گیا تھا
قرآن میں ذکر ہے کہ اللہ نے انسان کی روحوں سے تخلیق سے پہلے ہی عہد لیا تھا:
”وَإِذْ أَخَذَ رَبُّكَ مِنْ بَنِي آدَمَ مِنْ ظُهُورِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ
وَأَشْهَدَهُمْ عَلَىٰ أَنْفُسِهِمْ أَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ ۖ قَالُوا بَلَىٰ“ (۱)
”اور جب تمہارے رب نے بنی آدم سے، ان کی پشتوں میں سے ان کی نسل
نکالی اور ان سے خود ان کے بارے میں گواہی لی: کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟ انہوں
نے کہا: کیوں نہیں؟ ہم گواہ ہیں۔“
یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ انسان کو مکمل اختیار اور شعور دیا گیا، اور وہ اپنے وجود
کے مقصد سے پہلے ہی واقف تھا۔

5. زندگی کے مقابلے میں عدم کی حقیقت
یہ کہنا کہ ”ہم سے زندگی کا اختیار نہیں پوچھا گیا، اس لیے یہ زبردستی ہے“، ایک غلط
مفروضہ پر مبنی ہے، کیونکہ ”عدم“ یعنی نہ ہونا کسی کے لیے فائدہ مند نہیں۔

زندگی میں کم از کم مواقع موجود ہیں کہ انسان اپنی حالت بہتر کر سکے، حق کو پہچان سکے، اور آخرت میں کامیابی حاصل کر سکے۔

اگر زندگی کی مشکلات کی وجہ سے کوئی اسے ناپسند کرتا ہے، تو مسئلہ زندگی میں نہیں، بلکہ اس کے طریقے میں ہے جس سے وہ زندگی کو دیکھ رہا ہے۔

یہ بالکل ایسا ہی ہے کہ کسی کو قیمتی گاڑی دے دی جائے، لیکن وہ اسے درست طریقے سے نہ چلائے اور پھر شکایت کرے کہ یہ گاڑی بوجھ ہے!

6. زندگی کے بغیر نہ خوشی کا تصور ممکن ہے، نہ کسی مقصد کا

اگر زندگی نہ ہوتی، تو:

نہ خوشی کا احساس ممکن ہوتا، نہ کسی بھی چیز کا تجربہ۔

نہ محبت کا احساس ہوتا، نہ کامیابی کی خوشی۔

نہ علم حاصل کرنا ممکن ہوتا، نہ حق و باطل میں فرق کرنا۔

زندگی ہی کی بدولت انسان کو یہ شعور حاصل ہوتا ہے کہ وہ اپنی ذات کو بہتر بنا سکے اور حقیقت کی تلاش کر سکے۔

نتیجہ: یہ اعتراف حقیقت میں زندگی کے فلسفے اور انسانی اختیار کے بنیادی

اصولوں کو نہ سمجھنے کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے۔

عدم میں ہوتے ہوئے، یہ سوال ہی ممکن نہیں ہوتا، اس لیے یہ اعتراف منطقی طور پر درست نہیں۔

زندگی زبردستی نہیں، بلکہ ایک نعمت اور موقع ہے جو ہر شخص کو اپنا مقام بنانے کے لیے دی گئی ہے۔

اگر پیدا ہونے سے پہلے پوچھا جاتا، تو کوئی جواب ہی نہ دے سکتا، کیونکہ وہ موجود

ہی نہیں ہوتا۔

قرآن میں ذکر ہے کہ تخلیق سے پہلے ہی انسان کی روح سے عہد لیا گیا تھا، اور وہ اپنے مقصد سے پہلے سے واقف تھا۔
زندگی کے بغیر کسی چیز کا تصور بھی ممکن نہیں، اس لیے زندگی کا ملنا خود ایک بڑی نعمت ہے، نہ کہ زبردستی۔

لہذا، یہ اعتراض حقیقت میں ایک مغالطہ (fallacy) ہے، کیونکہ زندگی کا ملنا زبردستی نہیں بلکہ ایک موقع ہے جو اللہ نے دیا، اور اس موقع کو کیسے استعمال کرنا ہے، یہ ہر انسان کے اختیار میں ہے۔

اعتراض نمبر 21: اگر اللہ سب کچھ خود بخود چلا رہا ہے، تو دعا کی کیا

ضرورت؟ کیا دعا اللہ کے فیصلے کو بدل سکتی ہے؟ اگر ہاں، تو کیا اس کا

مطلب یہ نہیں کہ اللہ کا پہلے کا فیصلہ غلط تھا؟

جواب: یہ اعتراض دعا اور تقدیر (Predestination & Fate) کے تعلق پر مبنی ہے۔ اعتراض کرنے والے کا موقف یہ ہے کہ اگر اللہ نے ہر چیز پہلے سے طے کر رکھی ہے، تو دعا کرنے سے کیا فرق پڑے گا؟ اور اگر دعا سے تقدیر بدلتی ہے، تو کیا اس کا مطلب یہ نہیں کہ اللہ کا پہلا فیصلہ غلط تھا؟

یہ ایک گہرا سوال ہے، لیکن جب اسے عقلی، منطقی، اور اسلامی اصولوں کی روشنی میں سمجھا جائے، تو اس کی حقیقت واضح ہو جاتی ہے۔

1. دعا اللہ کی تقدیر کا ہی ایک حصہ ہے

بعض لوگ دعا اور تقدیر کو دو علیحدہ چیزیں سمجھتے ہیں، جبکہ حقیقت میں دعا خود تقدیر کا ایک حصہ ہے۔

تقدیر دو اقسام کی ہوتی ہے:

مطلق (تقدیر مبرم) جو کبھی نہیں بدلتی، جیسے موت کا وقت۔

مشروط (تقدیر معلق) جو حالات اور اعمال کی بنیاد پر بدل سکتی ہے، جیسے کسی بیماری سے نجات یا مشکلات کا حل۔

دعا اسی مشروط تقدیر کا حصہ ہے، یعنی اللہ نے پہلے سے ہی یہ طے کیا ہوتا ہے کہ اگر بندہ دعا کرے گا، تو اس کی تقدیر میں تبدیلی آئے گی۔ یہ بالکل ایسے ہے کہ اگر کوئی شخص دوائی لیتا ہے، تو بیماری ختم ہو جاتی ہے۔ کیا یہ کہنا درست ہوگا کہ اگر دوائی سے بیماری ختم ہوگئی، تو پہلے سے لکھی ہوئی تقدیر غلط ہوگئی؟ نہیں! بلکہ اللہ نے پہلے سے لکھ رکھا تھا کہ اگر بندہ دعا کرے گا، تو اس کا معاملہ بدل جائے گا۔

2. دعا تقدیر کے خلاف نہیں، بلکہ اس کا ایک ذریعہ ہے

بعض لوگ سمجھتے ہیں کہ دعا اللہ کے فیصلوں میں مداخلت ہے، جبکہ حقیقت میں دعا خود اللہ کی طرف سے مقرر کردہ ایک نظام کا حصہ ہے۔

نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

"لَا يَرُدُّ الْقَدَرُ إِلَّا الدُّعَاءُ" (۱)

"تقدیر کو کوئی چیز نہیں بدلتی، سوائے دعا کے۔"

یہ حدیث واضح کرتی ہے کہ دعا ہی وہ ذریعہ ہے جس کے ذریعے اللہ کی مقرر کردہ

تقدیر میں تبدیلی آتی ہے، اور یہ تبدیلی بھی اللہ کی ہی مرضی سے ہوتی ہے۔
مثال: اگر کوئی شخص روزگار کے لیے دعا کرتا ہے اور محنت کرتا ہے، تو اللہ اس کے لیے روزی کے دروازے کھول دیتا ہے۔ کیا یہ کہنا درست ہوگا کہ اللہ نے پہلے غلط فیصلہ کیا تھا؟ نہیں! بلکہ اللہ نے پہلے سے ہی یہ طے کر رکھا تھا کہ اگر یہ شخص دعا اور محنت کرے گا تو اس کی تقدیر بدلے گی۔

3. دعا کا اصل مقصد: اللہ سے تعلق اور بندگی کا اظہار
 دما محض تقدیر کو بدلنے کے لیے نہیں، بلکہ یہ اللہ کے ساتھ تعلق قائم کرنے کا ذریعہ بھی ہے۔ دعا انسان کے عاجزی اور انکساری کا اظہار ہے کہ وہ اللہ کا محتاج ہے۔ اگر دعا نہ ہوتی، تو انسان میں تکبر پیدا ہو جاتا، اور وہ خود کو خود مختار سمجھنے لگتا۔ قرآن میں اللہ فرماتا ہے:

"وَقَالَ رَبُّكُمْ ادْعُونِي أَسْتَجِبْ لَكُمْ" (۱)

"اور تمہارے رب نے فرمایا: مجھ سے دعا کرو، میں تمہاری دعا قبول کروں گا۔"
 یہ آیت واضح کرتی ہے کہ اللہ نے خود انسان کو دعا کا حکم دیا ہے، اور یہ اس کی رحمت کا حصہ ہے کہ وہ بندے کی دعاؤں کو سنتا اور قبول کرتا ہے۔

4. اگر دعا نہ ہو، تو دنیا ایک بے روح نظام بن جائے
 اگر دعا کا تصور نکال دیا جائے، تو دنیا ایک "میکانیکی نظام" بن جائے گی، جہاں سب کچھ پہلے سے طے ہے اور کسی کو کسی تبدیلی کی امید نہیں۔

دعا انسان میں امید، حوصلہ، اور جدوجہد کا جذبہ پیدا کرتی ہے۔ دعا بندے کو یہ احساس دلاتی ہے کہ وہ اپنے مسائل میں تنہا نہیں، بلکہ ایک اعلیٰ

ہستی اس کی مدد کے لیے موجود ہے۔

مثال: ایک بچہ جب کسی مشکل میں ہوتا ہے، تو وہ اپنے والدین سے مدد مانگتا ہے۔

کیا اس کا والد پہلے سے یہ نہیں جانتا کہ بچہ کس چیز کی ضرورت محسوس کرے گا؟ جانتا ہے! لیکن پھر بھی والدین چاہتے ہیں کہ بچہ ان سے مانگے، کیونکہ یہی محبت اور تعلق کا اظہار ہے۔ بالکل اسی طرح، اللہ جانتا ہے کہ بندے کو کیا چاہیے، لیکن وہ چاہتا ہے کہ بندہ دعا کے ذریعے اپنی عاجزی کا اظہار کرے۔

5. دعا اللہ کی حکمت اور رحمت کو ظاہر کرتی ہے
کبھی ایسا ہوتا ہے کہ انسان کسی چیز کی دعا مانگتا ہے، لیکن وہ پوری نہیں ہوتی۔
کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ دعا قبول نہیں کرتا؟
نہیں! بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ وہی چیز دیتا ہے جو بندے کے لیے بہتر ہو۔

نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:
”جب کوئی مسلمان دعا کرتا ہے، تو اللہ اسے تین میں سے ایک چیز عطا کرتا ہے:
یا تو وہ چیز فوراً دے دی جاتی ہے،
یا اس دعا کے بدلے کوئی مصیبت ٹال دی جاتی ہے،
یا اسے آخرت میں اس کا بہتر اجر دے دیا جاتا ہے۔ (۱)
یہ حدیث واضح کرتی ہے کہ ہر دعا قبول ہوتی ہے، بس اس کا طریقہ مختلف ہو سکتا ہے۔

نتیجہ: یہ اعتراض حقیقت میں دعا کے فلسفے کو نہ سمجھنے کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے۔ دعا اللہ کی تقدیر کا حصہ ہے، اور دعا کے ذریعے جو تبدیلی آتی ہے، وہ پہلے سے ہی اللہ کے علم میں ہوتی ہے۔

دعا اور تقدیر میں تضاد نہیں، بلکہ دعا تقدیر کو بہتر بنانے کا ذریعہ ہے، جیسے دوائی بیماری کا علاج کرتی ہے۔

دعا کا اصل مقصد اللہ سے تعلق قائم کرنا اور بندگی کا اظہار کرنا ہے، نہ کہ صرف دنیاوی مفادات حاصل کرنا۔

اگر دعا نہ ہو، تو دنیا ایک بے روح نظام بن جائے، جہاں انسان کی کوشش اور دعا کا کوئی فائدہ نہ ہو۔

اللہ ہر دعا سنتا ہے، لیکن وہ وہی چیز دیتا ہے جو بندے کے لیے بہتر ہو، چاہے وہ دنیا میں ہو یا آخرت میں۔

لہذا، یہ اعتراض دراصل دعا کے فلسفے کو نہ سمجھنے کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے، کیونکہ دعا تقدیر کے خلاف نہیں، بلکہ اس کا ایک اہم حصہ ہے۔

اعتراض نمبر 22: اگر کوئی شخص نیک زندگی گزارتا ہے لیکن اسلام

قبول نہیں کرتا، تو کیا وہ بھی جہنم میں جائے گا؟ کیا یہ انصاف ہے؟

جواب: یہ اعتراض نجات (Salvation) اور اسلامی تصورِ عدل کے بارے میں ہے۔ اعتراض کرنے والے کا موقف یہ ہے کہ اگر کوئی شخص پوری زندگی نیکی اور اخلاقیات کے ساتھ گزارتا ہے، لیکن اسلام قبول نہیں کرتا، تو کیا اسے جہنم میں ڈالنا انصاف ہوگا؟

اسے مذہبی تکثیریت (Religious Pluralism) اور عالمی انصاف (Divine Justice) کے تناظر میں اٹھایا جاتا ہے۔ اس اعتراض کا عقلی، منطقی، اور قرآنی بنیادوں پر تجزیہ کرنے سے اس کا جواب واضح ہو جاتا ہے۔

1. دنیا میں نیکی کی جزا دنیا ہی میں ملتی ہے، جبکہ آخرت میں نجات کے لیے ایمان ضروری ہے

اسلام کا اصول یہ ہے کہ اگر کوئی شخص دنیا میں نیک عمل کرتا ہے، تو اس کی جزا اسے اسی دنیا میں دی جاتی ہے، چاہے وہ مومن ہو یا کافر۔

ایک غیر مسلم اگر ایمان داری، سخاوت، اور انصاف پسندی اختیار کرتا ہے، تو وہ دنیا میں عورت، مال، اور سکون پاتا ہے۔

وہ قومیں جو سچائی، محنت، اور عدل کو اپناتی ہیں، انہیں دنیا میں ترقی اور کامیابی نصیب ہوتی ہے، چاہے وہ ایمان نہ رکھتی ہوں۔

قرآن میں اللہ فرماتا ہے:

"مَنْ كَانَ يُرِيدُ الْعَاجِلَةَ جَعَلْنَا لَهُ فِيهَا مَا نَشَاءُ لِمَنْ نُرِيدُ" (۱)

"جو کوئی دنیا کی زندگی چاہتا ہے، ہم اسے دنیا میں وہی دے دیتے ہیں جو ہم چاہتے ہیں، جس کے لیے ہم چاہتے ہیں۔"

لیکن آخرت کی کامیابی کے لیے محض نیک اعمال کافی نہیں، بلکہ ایمان بھی ضروری ہے۔

"وَالْآخِرَةُ عِنْدَ رَبِّكَ لِلْمُتَّقِينَ" (۲)

"اور آخرت تمہارے رب کے ہاں صرف متقیوں کے لیے ہے۔"

(۱) الإسراء: ۱۸۔

(۲) الزخرف: ۳۵۔

یہی وجہ ہے کہ دنیا کی نیکی کی جزا دنیا میں ملتی ہے، لیکن آخرت کی نجات ایمان کے بغیر ممکن نہیں۔

2. حقیقی نجات کا دار و مدار ”نیکی“ پر نہیں، بلکہ ”حق کو قبول کرنے“ پر ہے۔
قرآن میں واضح کیا گیا ہے کہ نجات (Salvation) کا بنیادی معیار صرف ظاہری نیک اعمال نہیں، بلکہ حق کی پہچان اور اس پر ایمان لانا بھی ضروری ہے۔
اگر نجات کا معیار محض نیک اعمال ہوتا، تو ابلیس سب سے زیادہ نیک تھا، کیونکہ اس نے سالوں سال عبادت کی تھی، لیکن صرف ایک حکم کی نافرمانی نے اسے مردود بنا دیا۔

نجات کا اصل معیار ”حق کو پہچاننے اور اسے قبول کرنے“ پر ہے، کیونکہ اگر کوئی جان بوجھ کر سچائی کو ٹھکرا دے، تو وہ اپنے انجام کا خود ذمہ دار ہے۔
قرآن کہتا ہے:

”إِنَّ الدِّينَ عِنْدَ اللَّهِ الْإِسْلَامُ“ (۱)

”بے شک اللہ کے نزدیک دین صرف اسلام ہے۔“

”وَمَنْ يَبْتَغِ غَيْرَ الْإِسْلَامِ دِينًا فَلَنْ يُقْبَلَ مِنْهُ وَهُوَ فِي

الْآخِرَةِ مِنَ الْخَاسِرِينَ“ (۲)

”جو کوئی اسلام کے علاوہ کسی اور دین کو اپنائے گا، وہ اس سے قبول نہ کیا جائے گا،
اور وہ آخرت میں نقصان اٹھانے والوں میں سے ہوگا۔“

یہ آیات واضح کرتی ہیں کہ نجات کا معیار صرف نیک اعمال نہیں، بلکہ صحیح عقیدہ اور

(۱) آل عمران: ۱۹۔

(۲) آل عمران: ۸۵۔

حق کا قبول کرنا بھی ہے۔

3. انصاف کا تقاضا: ہر شخص کو اس کی نیت اور کوشش کے مطابق جزا و سزا ملے گی اللہ کسی پر ظلم نہیں کرتا، اور ہر شخص کے ساتھ انصاف ہوگا۔ اگر کسی کو حق پوری طرح پہنچا، لیکن اس نے پھر بھی انکار کیا، تو وہ اپنے انجام کا خود ذمہ دار ہے۔ اگر کوئی حق کی تلاش میں رہا، لیکن اس تک مکمل سچائی نہیں پہنچی، تو اللہ اس کے ساتھ اسی حساب سے معاملہ کرے گا۔ قرآن میں اللہ فرماتا ہے:

"لَا يُكَلِّفُ اللَّهُ نَفْسًا إِلَّا وُسْعَهَا" (۱)

"اللہ کسی جان پر اس کی طاقت سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالتا۔"

یہی عدل کا تقاضا ہے کہ ہر شخص کو اس کی نیت، علم، اور کوشش کے مطابق پرکھا جائے، نہ کہ ظاہری اعمال کی بنیاد پر۔

نتیجہ: یہ اعتراض حقیقت میں نجات کے اسلامی تصور کو نہ سمجھنے کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے۔

1. دنیا میں نیک اعمال کرنے والے کو دنیا میں ہی اس کا بدلہ مل جاتا ہے، لیکن آخرت میں نجات کے لیے ایمان ضروری ہے۔

2. نجات کا دار و مدار صرف ظاہری نیکی پر نہیں، بلکہ حق کو پہچاننے اور قبول کرنے پر بھی ہے۔

3. اسلام میں نجات کا تصور "حق کی پہچان، قبولیت، اور نیک اعمال" پر مبنی ہے، اور ہر شخص کا فیصلہ اس کی نیت اور کوشش کے مطابق ہوگا۔

لہذا، یہ اعتراض حقیقت میں اسلام کے اصل تصور نجات کو نظر انداز کرتا ہے، کیونکہ

نجات کا معیار محض نیک اعمال نہیں، بلکہ حق کو پہچانا اور اسے اپنانا بھی ضروری ہے۔

اعتراض نمبر 23: اگر اللہ واقعی موجود ہے، تو پھر مذہب کو

پھیلانے کے لیے نبیوں کی ضرورت کیوں؟ کیوں اللہ خود

سب پر اپنی حقیقت واضح نہیں کرتا؟

جواب: یہ اعتراض اللہ کی ہدایت کے نظام اور نبوت کی ضرورت پر مبنی ہے۔

اگر اللہ خود سب کے سامنے ظاہر ہو جاتا، تو انسانوں کے پاس ایمان لانے کے علاوہ کوئی چارہ نہ رہتا، اور امتحان کا مقصد ختم ہو جاتا۔ لیکن نبیوں کی ضرورت صرف اس وجہ سے نہیں کہ اللہ غیب میں ہے، بلکہ اس لیے بھی تھی کہ انسانوں کو ایک عملی نمونہ درکار تھا۔

1. انسان کو ایک حقیقی، عملی مثال درکار تھی

اگر کوئی ایسا انسان موجود نہ ہوتا جو اللہ پر کامل یقین رکھ کر اس کے احکامات پر عمل کر سکے، تو لوگ یہ کہہ کر بری الذمہ ہو سکتے تھے کہ اللہ کی عبادت اور دین پر چلنا انسانی بس کی بات نہیں۔ نبیوں کا وجود اس بات کا ثبوت ہے کہ انسان اپنی روزمرہ کی زندگی، کاروبار، شادی، خوشی، غم، جنگ، اور امن کے دوران بھی اللہ کے دین پر مکمل عمل کر سکتا ہے۔ نبی صرف ایک پیغام رساں نہیں، بلکہ ایک جیتا جاگتا نمونہ ہوتا ہے کہ اللہ کے قوانین پر کیسے عمل کیا جائے، اور کیسے انہیں زندگی کا حصہ بنایا جائے بغیر یہ کہے کہ یہ ایک ناقابل برداشت بوجھ ہے۔

اللہ فرماتا ہے:

"لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ" (۱)

”بے شک تمہارے لیے رسول اللہ ﷺ کی زندگی میں بہترین نمونہ ہے۔“

یہی وجہ ہے کہ اللہ نے انسانوں کے لیے نبی بھیجے، تاکہ وہ صرف احکام بیان نہ کریں بلکہ ان پر عمل کر کے دکھائیں، اور لوگوں کے لیے دین کو اپنانا آسان ہو جائے۔

2. انسان فطرتاً دوسروں کی تقلید کرتا ہے، محض اصولوں کی کتاب کافی نہیں ہوتی اگر صرف قرآن یا دیگر آسمانی کتب بھیجی جاتیں، لیکن کوئی نبی نہ ہوتا، تو انسان محض اصول پڑھ کر ان پر عمل کرنے کے قابل نہ ہوتا۔

انسان فطرتاً نظریے سے زیادہ عملی مثال سے سیکھتا ہے۔

بچے کتابوں سے زیادہ اپنے والدین اور ماحول سے سیکھتے ہیں۔

قومیں اپنے رہنماؤں کے کردار سے متاثر ہو کر کوئی راستہ اپناتی ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ اللہ نے نبیوں کو عملی رہنما کے طور پر بھیجا، تاکہ انسان محض نظریاتی تعلیمات سے نہیں بلکہ عملی مشاہدے سے دین کو اپنائے۔

3. نبی اس بات کی گواہی دیتے ہیں کہ اللہ کا حکم انسانی فطرت کے مطابق ہے

اگر نبی نہ ہوتے، تو لوگ کہہ سکتے تھے کہ اللہ کے احکامات سخت ہیں، اور انہیں اپنانا انسان کے لیے ممکن نہیں۔

نبیوں نے یہ ثابت کیا کہ اللہ کے احکام انسانی فطرت کے خلاف نہیں، بلکہ اس کے ساتھ ہم آہنگ ہیں۔

انہوں نے ہر زمانے کے لوگوں کو دکھایا کہ شریعت کو کیسے ایک متوازن اور عملی زندگی میں شامل کیا جاسکتا ہے۔

اگر نبی نہ ہوتے، تو ہر دور کے لوگ اپنی زندگیوں کو دیکھ کر یہی سمجھتے کہ دین محض فرشتوں یا غیر حقیقی دنیا کے لیے ہے، نہ کہ ہمارے جیسے انسانوں کے لیے۔

4. وحی کے غلط مفہوم کو روکنے کے لیے نبیوں کی ضرورت تھی
محض ایک کتاب دینے سے یہ خطرہ تھا کہ لوگ اس کے الفاظ کو اپنی مرضی کے
مطابق معنی دے کر گمراہ ہو جائیں۔

تاریخ میں ہمیں نظر آتا ہے کہ کئی فلسفیانہ مکاتب فکر اور دیگر مذاہب میں تحریف
ہوئی، کیونکہ انہیں کوئی عملی نمونہ رہنمائی کے لیے نہیں ملا۔
نبی صرف اللہ کے پیغام کو لانے والے نہیں تھے، بلکہ اس کے صحیح مفہوم کو واضح
کرنے والے بھی تھے۔

یہی وجہ ہے کہ ہر نبی نے وحی کے ساتھ ساتھ عملی زندگی کے ذریعے اس کی درست
تفہیم دی، تاکہ لوگ اصل دین کو سمجھ سکیں۔

نتیجہ: یہ اعتراض حقیقت میں نبوت اور اللہ کی حکمت کے فلسفے کو نہ سمجھنے کی
وجہ سے پیدا ہوتا ہے۔

انسان کو ایک حقیقی عملی مثال درکار تھی، تاکہ یہ نہ کہا جاسکے کہ دین پر عمل انسان
کے لیے ممکن نہیں۔

انسان فطرتاً دوسروں کی تقلید کرتا ہے، محض اصولوں کی کتاب کافی نہیں ہوتی، بلکہ
عملی نمونہ ضروری ہوتا ہے۔

نبیوں نے یہ ثابت کیا کہ اللہ کے احکامات انسانی فطرت کے مطابق ہیں اور ان
پر عمل ممکن ہے۔

محض وحی کے الفاظ دینے سے لوگ اس کا غلط مفہوم نکال سکتے تھے، نبیوں نے
اس کے اصل معنی کو واضح کیا۔

لہذا، نبیوں کی ضرورت محض اللہ کا پیغام پہنچانے کے لیے نہیں تھی، بلکہ انسانوں

کے لیے ایک زندہ اور عملی نمونہ فراہم کرنے کے لیے تھی، تاکہ دین کو اپنانا ایک فطری اور آسان عمل بن جائے۔

اعتراض نمبر 24: اگر اسلام سچ ہے تو کیا وجہ ہے کہ آج سب سے

زیادہ پریشان حال مسلم ممالک ہی ہیں، چاہے وہ غرہ ہو یا برما؟ جبکہ

اللہ کو نہ ماننے والے ہی طاقتور اور سکون کی زندگی گزار رہے ہیں؟

جواب: یہ اعتراض مسلم امہ کی موجودہ حالت، اللہ کی نصرت، اور دنیاوی کامیابیوں کے تعلق پر مبنی ہے۔ اعتراض کرنے والے کا موقف یہ ہے کہ اگر اسلام حق پر ہوتا، تو مسلمان ممالک دنیا میں خوشحال اور طاقتور ہوتے، جبکہ حقیقت اس کے برعکس نظر آتی ہے۔

یہ ایک گہرا سماجی، تاریخی، اور منطقی سوال ہے، جس کا عقلی، منطقی، اور اسلامی اصولوں کی روشنی میں تجزیہ کیا جائے تو اس کی حقیقت واضح ہو جاتی ہے۔

1. کامیابی کا مطلب ہمیشہ دنیاوی خوشحالی نہیں ہوتا

یہ فرض کر لینا کہ جس قوم کے پاس دولت اور طاقت زیادہ ہے، وہی حق پر ہے، ایک بنیادی منطقی غلطی (Fallacy) ہے۔

تاریخ میں دیکھیں تو بڑی بڑی ظالم سلطنتیں عروج پر رہیں، لیکن کیا وہ حق پر تھیں؟ فرعون، چنگیز خان، ہٹلر، اور رومی سلطنت جیسے حکمران اور قومیں اپنے وقت میں طاقتور اور خوشحال تھیں، لیکن کیا یہ دلیل ہے کہ وہ حق پر تھے؟

اگر دنیاوی کامیابی حق کا معیار ہوتی، تو ہر ایماندار اور سچے شخص کو دنیا میں سب سے

زیادہ دولت مند ہونا چاہیے تھا، جبکہ دنیا کی تاریخ میں کبھی مخلص اور نیک لوگ مشکلات میں رہے۔

قرآن میں اللہ فرماتا ہے:

"وَلَا يَغُرُّكَ تَقَلُّبُ الَّذِينَ كَفَرُوا فِي الْبِلَادِ، مَتَاعٌ قَلِيلٌ
ثُمَّ مَأْوَاهُمْ جَهَنَّمُ وَبُنُسُ الْبِهَادُ" (۱)

"کافروں کا شہروں میں گھومنا پھرنا تمہیں دھوکے میں نہ ڈالے، یہ بس تھوڑا سا فائدہ ہے، پھر ان کا ٹھکانا جہنم ہے، اور وہ بہت برا ٹھکانا ہے۔"
یعنی دنیا میں کسی کی وقتی کامیابی، اللہ کی طرف سے حق یا باطل کا معیار نہیں ہوتی۔
2. اللہ نے دنیا میں کامیابی کو ایک اصول کے تحت رکھا ہے، جو ہر ایک پر لاگو ہوتا ہے۔

دنیا میں اللہ کا ایک سسٹم (Cause and Effect) ہے، جہاں کامیابی صرف مذہب کی بنیاد پر نہیں، بلکہ محنت، نظم و ضبط، اور سائنسی ترقی کی بنیاد پر ملتی ہے۔ اگر کوئی مسلمان ملک تعلیم، تحقیق، اور منصوبہ بندی میں کمزور ہوگا، تو وہ ترقی نہیں کرے گا، چاہے وہ اسلام کو مانتا ہو۔ اگر مسلمان ترقی چاہتے ہیں، تو انہیں اسباب اختیار کرنے ہوں گے، جیسا کہ قرآن میں اصول دیا گیا ہے:

"إِنَّ اللَّهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتَّى يُغَيِّرُوا مَا بِأَنْفُسِهِمْ"

"بے شک اللہ کسی قوم کی حالت نہیں بدلتا جب تک وہ خود اپنی حالت کو نہ بدلے۔"

(۱) آل عمران: 196-197۔

(۲) الرعد: 11۔

مثال: اگر ایک غیر مسلم ملک سائنسی ترقی، تحقیق، اور معیشت پر کام کرے، تو وہ کامیاب ہوگا، چاہے وہ اسلام پر نہ ہو۔
اگر کوئی مسلمان ملک تعلیم، معیشت، اور حکمت عملی کو نظر انداز کرے، تو وہ کمزور ہوگا، چاہے وہ اسلام پر ہو۔

یہی وجہ ہے کہ ماضی میں جب مسلمان علم و ترقی میں آگے تھے، وہ دنیا میں بھی غالب تھے، جیسے خلافت عباسیہ اور سلطنت عثمانیہ کے دور میں۔

اسلاموفوبیا اور دوہرے معیارات:

پہلے راستے بند کرو، پھر مسلمانوں کو مورد الزام ٹھہراؤ؟
یہ بھی ایک کھلا تضاد ہے کہ وہی ملحد اور سیکولر طاقتیں جو آج مسلمانوں کی پس ماندگی پر اعتراض کر رہی ہیں، خود ہی ان کے آگے بڑھنے کے مواقع کو روکتی ہیں۔ مسلمانوں پر تعلیمی اور سائنسی ترقی کے دروازے بند کیے جاتے ہیں، ان کے خلاف منظم پراپیگنڈہ کیا جاتا ہے، اور ان کے تعلیمی ادارے، معیشت، اور معاشرتی ڈھانچے کمزور کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔

اسلاموفوبیا کو جان بوجھ کر پھیلایا جاتا ہے، تاکہ مسلمان دفاعی پوزیشن پر چلے جائیں اور آگے نہ بڑھ سکیں۔ جب ان پر ظلم ہو رہا ہوتا ہے، تو عالمی طاقتیں خاموش تماشاخی بنی رہتی ہیں، لیکن جب مسلمان اپنی حالت بدلنے کی کوشش کرتے ہیں، تو انہیں شدت پسندی، دہشت گردی، اور قدامت پرستی کے الزامات میں جکڑ دیا جاتا ہے۔ فلسطین، کشمیر، برما، چین، اور دیگر جگہوں پر مسلمانوں پر مظالم ڈھائے جا رہے ہیں، لیکن عالمی برادری خاموش ہے۔

مسلمان اگر اپنی شناخت کے ساتھ کسی بھی ترقی یافتہ فیلڈ میں آگے بڑھنے کی کوشش کریں، تو انہیں مختلف حیلوں بہانوں سے روکنے کی کوشش کی جاتی ہے۔

یہ کہاں کا انصاف ہے کہ:

1. مسلمانوں کو خود ظلم اور نا انصافی کا شکار کرو۔
2. پھر ان پر پابندیاں لگاؤ، انہیں سائنسی، تعلیمی، اور معاشی ترقی سے روکو۔
3. اور آخر میں یہی اعتراض کرو کہ ”مسلمان ترقی کیوں نہیں کر رہے؟“

یہ دوہرا معیار (Double Standards) کیوں؟

لہذا، یہ کہنا کہ ”اگر اسلام سچ ہوتا تو مسلمان طاقتور ہوتے“ ایک غیر منصفانہ اعتراض ہے، کیونکہ وہی طاقتیں جو مسلمانوں کو پسماندہ رکھ رہی ہیں، وہی ان کی پسماندگی پر اعتراض بھی کر رہی ہیں۔

مسلمانوں کی پریشانی کا ایک بڑا سبب ان کا دین سے عملی دوری بھی ہے، نہ کہ اسلام کی سچائی کا مسئلہ اگر اسلام کو ماننا ہی کامیابی کی ضمانت ہوتا، تو ہر مسلمان ملک ترقی یافتہ ہوتا، لیکن مسلمانوں کا بڑا مسئلہ یہ ہے کہ وہ صرف اسلام کو نام کی حد تک اپنائے ہوئے ہیں، جبکہ ان کی عملی زندگی میں اسلامی اصولوں کی کمی ہے۔

مسلمان تعلیم، اتحاد، سائنسی ترقی، اور محنت سے پیچھے ہٹ چکے ہیں، اور فرقہ واریت، بدعنوانی، اور انتشار میں مبتلا ہیں۔

قرآن میں اللہ فرماتا ہے:

وَأَطِيعُوا اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَلَا تَنَازَعُوا فَتَفْشَلُوا وَتَذْهَبَ رِيحُكُمْ (۱)

”اور اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو، اور آپس میں جھگڑانہ کرو، ورنہ تم ناکام ہو جاؤ گے اور تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی۔“
یہی نا اتفاقی، سستی، اور دین سے عملی دوری مسلمانوں کی کمزوری کی بڑی وجوہات ہیں۔

4. ظالم قوموں کو مہلت دی جاتی ہے، لیکن وہ ہمیشہ کامیاب نہیں رہتیں
اللہ نے دنیا میں ظلم اور انصاف دونوں کو آزمائشی طور پر مہلت دی ہے۔
ظالم قومیں وقتی طور پر طاقتور ہو سکتی ہیں، لیکن ان کا انجام بھی عبرتناک ہوتا ہے،
جیسا کہ تاریخ میں ہوا۔

قرآن میں اللہ فرماتا ہے:

"وَتِلْكَ الْأَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ" (۱)

”یہ دن ہم لوگوں کے درمیان گردش دیتے رہتے ہیں (کبھی کسی کو اقتدار دیتے ہیں، کبھی کسی کو)۔“

فرعون، ہٹلر، چنگیز خان، اور دوسری ظالم طاقتیں بھی اپنے وقت میں غالب تھیں،
لیکن کیا وہ ہمیشہ باقی رہیں؟ آج بھی جو قومیں ظلم کر رہی ہیں، وہ ہمیشہ نہیں رہیں گی، اور
اللہ کی گرفت میں ضرور آئیں گی۔

5. مسلمانوں کی آزمائش، لیکن آخرت میں ان کے لیے کامیابی

یہ دنیا اصل انصاف کی جگہ نہیں، بلکہ امتحان کی جگہ ہے۔

اگر کوئی قوم یا فرد دنیا میں مشکلات کا سامنا کر رہا ہے، تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ
ناکام ہے، بلکہ یہ اس کی آزمائش ہو سکتی ہے۔

نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

”دنیا مومن کے لیے قید خانہ ہے اور کافر کے لیے جنت۔“ (۱)
یعنی دنیا میں مومن کے لیے مشکلات آسکتی ہیں، لیکن آخرت میں اس کے لیے کامیابی ہے۔

نتیجہ: یہ اعتراض حقیقت میں دنیاوی کامیابی اور اصل کامیابی کے فرق کو نہ سمجھنے کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے۔

1. دنیا میں کسی کی وقتی کامیابی اس کے حق یا باطل ہونے کی دلیل نہیں۔
2. اللہ نے دنیا میں ایک اصول بنایا ہے کہ جو بھی محنت کرے گا، ترقی کرے گا، چاہے وہ مومن ہو یا نہ ہو۔
3. مسلمانوں کی کمزوری ان کے اپنے اعمال اور دین سے عملی دوری کی وجہ سے ہے، نہ کہ اسلام کی سچائی پر کوئی سوالیہ نشان۔
4. ظالم قوموں کو مہلت دی جاتی ہے، لیکن وہ ہمیشہ کامیاب نہیں رہتیں۔
5. یہ دنیا اصل انصاف کی جگہ نہیں، بلکہ امتحان کی جگہ ہے، اور آخرت میں اصل کامیابی کا فیصلہ ہوگا۔

لہذا، یہ اعتراض دنیاوی حالات کو سطحی نظر سے دیکھنے کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے، جبکہ اصل کامیابی صرف دنیاوی ترقی نہیں، بلکہ ایمان، صبر، اور آخرت کی کامیابی ہے۔

اعترض نمبر 25: اگر کوئی چیز بھلا دی جائے تو کیا وہ درست ہے؟ اگر عہدِ الست حقیقی تھا، تو پھر لوگوں کو دنیا میں آ کر وہ

کیوں یاد نہیں رہتا؟

جواب: یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے طلبہ علم حاصل کرتے ہیں، لیکن وقت گزرنے کے ساتھ وہ اس کی تفصیلات بھول جاتے ہیں۔ تاہم، ان کے اندر سیکھنے اور علم حاصل کرنے کی صلاحیت (Potential) بدستور باقی رہتی ہے۔

اسی طرح، انسان کو اللہ کی پہچان (معرفتِ الہی) فطرت میں ودیعت کی گئی ہے، لیکن دنیاوی مصروفیات کی وجہ سے وہ اسے بھول سکتا ہے۔ عہدِ الست بھی اسی اصول کے تحت انسان کی فطرت میں موجود ہے، لیکن دنیا کی آزمائش اور مادی مشغولیات کی وجہ سے انسان اس کی تفصیلات بھول جاتا ہے۔

یہ حدیث میں بھی واضح ہے: ”ہر بچہ فطرت پر پیدا ہوتا ہے۔“

یعنی انسان کی فطرت میں ہی اللہ کی معرفت موجود ہے، لیکن وہ وقت کے ساتھ بھول سکتا ہے۔ لیکن جیسے ہی کوئی شخص حق کی جستجو کرے، تو وہ دوبارہ اللہ کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے، کیونکہ یہ فطرت کے عین مطابق ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ کا شعور انسان کی حقیقت میں پیوست ہے، اور بھول جانے کا مطلب یہ نہیں کہ وہ چیز سرے سے موجود نہیں تھی۔ (۱)

اعتراض 26: اگر اسلام واقعی ایک عادلانہ اور پُر امن مذہب ہے، تو پھر دانشور اور تعلیم یافتہ غیر مسلم اسے معاشرے کے لیے خطرہ کیوں سمجھتے ہیں؟

جواب: یہ ایک عام غلط فہمی ہے کہ غیر مسلم مفکرین نے اسلام کی سچائی کو کبھی تسلیم نہیں کیا۔ حقیقت یہ ہے کہ تاریخ کے کئی مشہور دانشوروں، فلسفیوں اور مؤرخین نے نہ صرف اسلام کی عظمت کو تسلیم کیا بلکہ نبی کریم ﷺ کی شخصیت اور اسلامی تعلیمات کو اعلیٰ ترین معیار پر پرکھا۔

لیکن پھر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر اسلام واقعی ایک منصفانہ، روادار اور پُر امن مذہب ہے، تو کیوں کچھ غیر مسلم دانشور اسے شدت پسندی اور معاشرتی خطرہ قرار دیتے ہیں؟ اس کی بنیادی وجہ متعصبانہ تحقیق، تاریخی واقعات کی غلط تشریح اور یکطرفہ بیانیہ ہے۔ مغربی مفکرین کا ایک بڑا طبقہ، جو اسلامی تاریخ اور اس کے قوانین کو گہرائی سے نہیں سمجھتا، چند جنگوں اور اسلامی فتوحات کو بنیاد بنا کر یہ غلط تصور پھیلاتا ہے کہ اسلام تلوار کے زور پر پھیلا۔

اگر اسلام واقعی زبردستی اور جبر سے پھیلنے والا مذہب ہوتا، تو ان علاقوں میں جہاں صدیوں تک اسلامی حکومتیں قائم رہیں، غیر مسلم اقوام کا وجود باقی نہ رہتا۔ خلافت راشدہ سے لے کر خلافت عثمانیہ تک، مسلم حکمرانوں نے غیر مسلموں کو مکمل مذہبی آزادی دی اور ان کے عقائد میں مداخلت نہیں کی۔ یہی وجہ ہے کہ کئی غیر مسلم مؤرخین اور دانشور اعتراف کرتے ہیں کہ اسلامی حکومتیں اپنے دور میں سب سے زیادہ روادار اور منصف مزاج تھیں۔

یہاں صرف چند غیر مسلم مفکرین کے اقوال پیش کیے جا رہے ہیں تاکہ یہ واضح ہو کہ جو بھی غیر جانبداری کے ساتھ اسلام کا مطالعہ کرتا ہے، وہ اس کی حقانیت کا قائل ہو جاتا ہے۔ جارج برنارڈشا (1856-1950) ایک مشہور انٹرش مصنف، نقاد، اور فلسفی تھے۔ وہ انگریزی زبان کے عظیم ترین ڈراما نویسوں میں شمار کیے جاتے ہیں اور 1925 میں ادب کا نوبل انعام جیتا تھا۔ برنارڈشا اپنی گہری فکری بصیرت، سماجی مسائل پر تنقید، اور معاشرتی روایات کو چیلنج کرنے کے انداز کے لیے مشہور تھے۔ اگرچہ وہ خود مسلمان نہیں تھے، لیکن انہوں نے اسلام اور نبی کریم ﷺ کی شخصیت کی بہت تعریف کی۔ ان کے نزدیک اسلام ایک ایسا مذہب تھا جو وقت کے ساتھ ہم آہنگ ہونے کی زبردست صلاحیت رکھتا ہے اور دنیا کے مسائل حل کرنے میں کامیاب ہو سکتا ہے۔

انہوں نے کہا: ”میں نے ہمیشہ محمد (ﷺ) کے دین کو اعلیٰ مقام دیا ہے کیونکہ اس میں حیرت انگیز زندگی بخشنے والی طاقت ہے۔ یہ واحد مذہب ہے جو مجھے ایسا لگتا ہے کہ اس میں یہ صلاحیت موجود ہے کہ وہ وقت کے بدلتے ہوئے تقاضوں کے مطابق خود کو ڈھال سکے اور ہر دور میں لوگوں کے لیے قابل قبول بن سکے۔ میں نے ان (محمد ﷺ) کا مطالعہ کیا ہے۔ وہ ایک حیرت انگیز شخصیت کے مالک تھے، اور میری رائے میں، وہ ہرگز جھوٹے یا فریبی نہیں ہیں، بلکہ انہیں انسانیت کا نجات دہندہ کہا جانا چاہیے۔ میں یقین رکھتا ہوں کہ اگر ان جیسا شخص آج کی دنیا کی حکمرانی سنبھال لے، تو وہ کامیابی کے ساتھ دنیا کے مسائل کو اس طرح حل کرے گا کہ اسے امن اور خوشی میسر آئے گی۔ میں نے پیش گوئی کی تھی کہ محمد ﷺ کے دین کو مستقبل میں یورپ قبول کرے گا، جیسا کہ آج کے یورپ میں اس کو قبولیت ملنی شروع ہو چکی ہے۔ (۱)

اسی طرح مہاتما گاندھی نے 1924 میں اپنے اخبار ”Young India“ میں

لکھا کہ اسلام کی کامیابی کسی تلوار کے زور پر نہیں، بلکہ نبی کریم ﷺ کی بے مثال سیرت اور اخلاقی اصولوں کی بدولت ہوئی۔ وہ لکھتے ہیں:

”میں اس ہستی کی زندگی کے بہترین پہلو جاننا چاہتا تھا، جو آج کروڑوں انسانوں کے دلوں پر بے مثال حکمرانی کر رہی ہے... میں اس نتیجے پر پہنچا کہ اسلام کی کامیابی کار از تلوار میں نہیں تھا، بلکہ وہ نبی کریم ﷺ کی سخت سادگی، مکمل بے نفسی، عہد و پیمان کی سختی سے پاسداری، اپنے ساتھیوں سے بے پناہ محبت، جرات و بہادری، بے خوفی، اللہ پر کامل یقین اور اپنے مشن پر غیر متزلزل اعتماد تھا۔ یہی وہ عناصر تھے جنہوں نے اسلام کو کامیاب بنایا اور ہر رکاوٹ کو عبور کرنے میں مدد دی۔ جب میں نے نبی کریم ﷺ کی سیرت کی دوسری جلد مکمل کی، تو مجھے افسوس ہوا کہ مزید پڑھنے کے لیے کچھ باقی نہ تھا۔“

اسی طرح، مشہور امریکی مصنف اور مؤرخ مائیکل ہارٹ نے اپنی کتاب میں نبی کریم ﷺ کو تاریخ کی سب سے زیادہ اثر و رسوخ رکھنے والی شخصیت کے طور پر پہلے نمبر پر رکھا۔ وہ لکھتے ہیں:

میرا محمد ﷺ کو دنیا کی سب سے زیادہ بااثر شخصیات کی فہرست میں پہلے نمبر پر رکھنا بعض قارئین کو حیران کر سکتا ہے اور کچھ لوگ اس پر سوال بھی اٹھا سکتے ہیں، لیکن وہ واحد شخصیت تھے جو دینی اور دنیاوی، دونوں میدانوں میں بے مثال کامیابی حاصل کرنے میں کامیاب رہے۔ (۱)

یہ ایک غیر مسلم مورخ اور محقق کا ناقابل تردید اعتراف ہے کہ نبی کریم ﷺ کی قیادت، اثر و رسوخ اور کامیابی محض مذہبی نہیں، بلکہ دنیاوی اور سیاسی طور پر بھی بے مثال تھی۔

(1) Dr Bernard Shaw, The Genius of Islam.

ایلییا، جو 1008 سے 1049 عیسوی تک نصیبین کا عالی مرتبت بپ تھا، کا ایک بیان ایک ایسے مسیحی مبلغ نے نقل کیا ہے جو خود اسلام کے بارے میں ہمدردانہ رویہ نہیں رکھتا تھا۔ اس کا بیان کچھ یوں ہے:

”ہم مسلمانوں کے بارے میں یہ اعتقاد رکھتے ہیں کہ ان کی فرمانبرداری اور محبت ہمیں ان تمام مذاہب اور سلطنتوں کے ماننے والوں کی فرمانبرداری سے زیادہ متاثر کرتی ہے جو ہمارے مخالف ہیں، خواہ ہم ان کی سر زمین میں ہوں یا نہ ہوں، اور خواہ وہ ہمارے ساتھ اچھا سلوک کریں یا نہ کریں۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ مسلمان اسے اپنے دین اور فرض کا حصہ سمجھتے ہیں کہ وہ ہماری حفاظت کریں، ہمارا احترام کریں اور ہمارے ساتھ اچھا برتاؤ کریں۔ اور اگر ان میں سے کوئی ہم پر ظلم کرے تو ان کا آقا یعنی ان کے نبی، قیامت کے دن اس کے خلاف ہوں گے۔ اور ان کا قانون ہمیں قبول کرتا ہے اور ہمیں دیگر مذاہب سے ممتاز کرتا ہے، خواہ وہ مجوسی ہوں، ہندو ہوں، صابی ہوں یا دیگر جو ہمارے مخالف ہیں۔ یہ بھی واضح ہے کہ جب مسلمان ہم پر ظلم کرتے ہیں اور ہم پر زیادتی کرتے ہیں، تو جب وہ اپنے قانون کی طرف رجوع کرتے ہیں تو وہ اس ظلم کو ظلم ہی قرار دیتے ہیں۔ لیکن دیگر مذاہب کے لوگ جب ہمارے ساتھ اچھا برتاؤ کرتے ہیں اور ہمیں عزت دیتے ہیں، اور اپنے قانون کی طرف رجوع کرتے ہیں، تو انہیں اپنے قانون میں اس نیکی کی کوئی ستائش نہیں ملتی۔ چنانچہ مسلمانوں کا ہم پر ظلم اور ان کی ہمارے خلاف دشمنی، اور یہ اعتراف کہ وہ ایسا کر کے اپنے ہی قانون کے خلاف عمل کر رہے ہیں، ہمارے لیے ان لوگوں کے اچھے سلوک سے بہتر ہے جو یہ اعتراف کرتے ہیں کہ ان کے قانون کے مطابق ہمارے ساتھ اچھا سلوک کرنا جائز ہی نہیں۔ (۱)

(1) Michael Hart, The 100: A Ranking of the Most Influential Persons in History, New York, 1978

یہ بات قابل غور ہے کہ اسلام کو اکثر اس کے ماننے والوں کے اعمال کی بنیاد پر جانچا جاتا ہے، جبکہ کسی بھی مذہب کی حقیقت کو سمجھنے کے لیے اس کے اصل اصولوں کو دیکھنا ضروری ہوتا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ مسلمان بھی دوسرے انسانوں کی طرح غلطیاں کر سکتے ہیں، ان میں بھی اچھے اور برے لوگ موجود ہو سکتے ہیں، لیکن کسی فرد یا گروہ کی غلطیوں کو پورے مذہب پر تھوپنا سراسر زیادتی ہے۔

ہر معاشرے میں کچھ سیاہ کردار (Black Sheep) ہوتے ہیں جو اپنے ذاتی مفادات، شدت پسندی یا غلط فہمیوں کی وجہ سے اپنے ہی مذہب کے اصولوں کے خلاف عمل کرتے ہیں۔ اگر کوئی مسلمان ناانصافی کرتا ہے، تو وہ اسلام کے اصولوں کے خلاف ورزی کر رہا ہوتا ہے، نہ کہ ان پر عمل۔ اسلام نے ہمیشہ عدل، رحمت اور رواداری کا حکم دیا ہے، اور اگر کوئی مسلمان ان اصولوں کو نظر انداز کرتا ہے، تو یہ اسلام کی نہیں، بلکہ اس شخص کی اپنی کوتاہی ہے۔

اسلام ظلم کو ظلم کہتا ہے، چاہے وہ کسی مسلمان سے سرزد ہو یا کسی غیر مسلم سے۔ مشہور مستشرق ولیم مونٹگمری واٹ ایک جگہ لکھتے ہیں:

”مجموعی طور پر، اسلامی حکومتوں میں غیر مسلموں کے ساتھ جو حقیقی رواداری برتی گئی، وہ قرون وسطیٰ کی عیسائی ریاستوں میں غیر عیسائیوں کے ساتھ کیے گئے سلوک سے زیادہ تھی۔“ (۱)

یہ وہ چند اقتباسات ہیں جو غیر مسلم مفکرین نے بیان کیے ہیں، نہ کہ کسی مسلمان نے، تاکہ کسی بھی جانبداری کا شبہ باقی نہ رہے۔ اسلام پر شدت پسندی، جبر اور ظلم و ستم کا الزام پھیلانے کے لیے گھڑا ہے۔ لیکن تاریخی حقائق اس کے برعکس تصویر پیش کرتے ہیں۔

(1) Muslim Understanding of Other Religions, S: 26

(2) The Eclipse of Christianity in Asia, S: 48-49.

اگر اسلام واقعی ایک ظالم اور جنگجویانہ مذہب ہوتا، تو اس کے زیرِ حکومت غیر مسلموں کو کبھی امن اور آزادی حاصل نہ ہوتی۔ اس حقیقت کو ثابت کرنے کے لیے حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کا معاہدہ بہترین مثال ہے۔

جب 639 عیسوی میں بیت المقدس کے عیسائی باشندوں نے اسلامی حکومت کے تحت امن و امان کو تسلیم کر لیا اور صلح پر رضامند ہو گئے، تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان کے لیے درج ذیل معاہدہ تحریر فرمایا:

بسم اللہ الرحمن الرحیم

یہ امان نامہ وہ ہے جو عمر، بندہ خدا اور امیر المؤمنین، اہل ایلیا کو عطا کرتا ہے۔ وہ تمام لوگوں کو، چاہے بیمار ہوں یا صحت مند، ان کی جان و مال، ان کے گرجا گھروں، ان کی صلیبوں، اور ان کے دین سے متعلق تمام امور کے لیے مکمل تحفظ فراہم کرتا ہے۔ ان کے گرجا گھروں کو نہ تو رہائش گاہوں میں تبدیل کیا جائے گا اور نہ ہی انہیں منہدم کیا جائے گا۔ ان کی کسی بھی مذہبی چیز یا املاک میں کوئی کمی نہیں کی جائے گی، نہ ہی ان کے عقیدے کے معاملے میں ان پر کسی قسم کا جبر کیا جائے گا، اور نہ ہی ان میں سے کسی کو کوئی نقصان پہنچایا جائے گا۔" (۱)

یہ صرف ایک مثال ہے، جبکہ اسلامی تاریخ میں ایسی بے شمار نظیریں موجود ہیں، جہاں مسلمان حکمرانوں نے غیر مسلموں کو مکمل مذہبی، سماجی اور قانونی حقوق فراہم کیے، اور ان کے ساتھ انصاف کیا۔ یہی حقیقت ہے جو متعصب مورخین اور اسلام مخالف نظریات کے حامل افراد ہمیشہ چھپانے کی کوشش کرتے ہیں۔

اگر دنیا کو اسلام کی حقیقی تاریخ اور اس کے عدل و انصاف پر مبنی نظام کو درست

طور پر دکھایا جاتا، تو آج اس پر شدت پسندی، جبر اور نا انصافی کے الزامات نہ لگائے جا رہے ہوتے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ تاریخ کو توڑ مروڑ کر پیش کیا گیا، تعلیمی نصاب میں جھوٹ شامل کیا گیا، اور میڈیا کے ذریعے مسلمانوں کی تصویر ایک وحشی اور شدت پسند قوم کے طور پر بنائی گئی۔

اسکولوں اور تعلیمی نصاب میں تاریخی حقائق کو مسخ کر کے پیش کیا جاتا ہے، تاکہ اسلام اور اس کی سنہری تاریخ کو خوفناک اور غیر انسانی نظریہ بنا کر پیش کیا جاسکے۔ جو تاریخ انصاف پر مبنی ہونی چاہیے تھی، وہ متعصب مؤرخین اور مخصوص ایجنڈا رکھنے والوں کے ہاتھوں بگاڑ دی گئی۔

مزید برآں، میڈیا اور فلم انڈسٹری نے اس گمراہی میں جلتی پر تیل ڈالنے کا کام کیا۔ وہ تاریخی مسلم شخصیات، جنہوں نے انصاف، تقویٰ اور حکمرانی میں مثالیں قائم کیں، انہیں فلموں اور ڈراموں میں ظالم اور عیاش بادشاہوں کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ اور نگزیب عالمگیر رحمہ اللہ، جو اپنی زہد و تقویٰ، انصاف پسندی اور عبادت میں معروف تھے، انہیں ایک سفاک اور جابر حکمران کے طور پر دکھایا جاتا ہے، جبکہ حقیقت یہ ہے کہ ان کے عدل، سادگی اور عوامی خدمت کی مثالیں خود مغربی مؤرخین بھی دیتے ہیں۔

یہی نہیں، بلکہ صلاح الدین ایوبی، ٹیپو سلطان اور دیگر مسلم حکمرانوں کو یا تو نظر انداز کیا گیا، یا انہیں بگاڑ کر ظالم حکمرانوں کے طور پر پیش کیا گیا۔

دوسری طرف، وہ حکمران جو واقعی ظلم، قتل و غارت اور سامراجی عزائم میں ڈوبے ہوئے تھے، انہیں ہیرو بنا کر پیش کیا گیا۔

میڈیا کی جھوٹی کہانیاں، فلموں میں گمراہ کن پروپیگنڈہ، نصاب میں رکھی گئی جھوٹی

معلومات، اور اسلاموفوبیا پر مبنی خبروں نے لوگوں کے ذہنوں میں اسلام کی ایک جھوٹی تصویر بٹھادی ہے۔

جسے روزانہ جھوٹ پر مبنی فلمیں، پروپیگنڈہ میڈیا، اور متعصبانہ تعلیمی نصاب پڑھایا جائے، اگر وہ اسلام کو شدت پسند سمجھے، تو اس میں اس کا قصور کم اور اس نظام کا قصور زیادہ ہے جو سچ کو چھپانے میں لگا ہوا ہے۔ اگر لوگوں کو صحیح تاریخ سکھائی جائے اور میڈیا کی عینک اتار کر حقیقت کا مشاہدہ کیا جائے، تو وہ خود دیکھیں گے کہ اسلام انسانیت کے لیے سب سے زیادہ عادلانہ اور پر امن مذہب ہے۔

چند معروضات

اس کتاب کو لکھتے ہوئے مجھے بخوبی اندازہ ہے کہ اس کے قارئین کا حلقہ محدود ہوگا۔ اس کی پہلی وجہ خود موضوع کی خشکی اور پیچیدگی ہے۔ مزید یہ کہ یہ کتاب غیر مسلم قارئین تک شاید ہی پہنچے، کیونکہ ان کی اردو زبان سے عدم واقفیت اسے ان کے لیے غیر مفید بنا دیتی ہے۔ یہاں تک کہ ایک عام مسلمان کے لیے بھی اس کتاب میں دلچسپی لینا آسان نہیں ہوگا، کیونکہ آج کے دور میں انسان سہولت پسند ہو چکا ہے۔ یوٹیوب اور دیگر ڈیجیٹل ذرائع اس کے لیے زیادہ آسان اور قابل رسائی ہیں، جبکہ کتاب خریدنا اور اس سے استفادہ کرنا اب صرف گنے چنے افراد تک محدود رہ گیا ہے۔

البتہ، اس کتاب کو علماء کرام کے مطالعے کے لیے زیادہ موزوں پایا جاسکتا ہے۔ یہ اس لیے نہیں کہ ہمارے مدارس کے فارغین میں بے علمی تڑپ یا شوق پایا جاتا ہے، بلکہ اس لیے کہ آج ان کے لیے ایسے فکری مسائل سے مانوس ہونا ناگزیر ہو چکا ہے۔ لوگ علماء کے پاس مختلف نظریاتی سوالات لے کر آتے ہیں، اور یہ ان کی ذمہ داری بن

جاتی ہے کہ وہ ان کے لشفی بخش جوابات فراہم کریں۔
دنیا کے حالات بڑی تیزی سے بدل رہے ہیں، اور نئے افکار اور نظریات کے ساتھ سامنا روز بروز بڑھتا جا رہا ہے۔ ایسے میں امام غزالیؒ کا قول بالکل درست معلوم ہوتا ہے:

من لم یعرف أحوال زمانه فهو جاهل

”جو اپنے زمانے کے حالات سے واقف نہ ہو، وہ جاہل ہے۔“
لہذا، آج کے دور کے تقاضوں کے مطابق خود کو تیار کرنا ہماری ذمہ داری ہے۔
الحمد للہ، بہت سے علماء نے اس ضرورت کو محسوس کیا ہے اور اس سمت میں کام کرنا شروع کر دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کی کوششوں کو قبول فرمائے اور ان کے علم کو نفع بخش بنائے۔

بہر حال، کتاب چاہے چند سو علماء تک پہنچے یا ہزار، میری نظر میں یہ لاکھوں افراد کے برابر ہے۔ یہی علماء اس پیغام کو اپنے خطبات، ورکشاپس، سوشل میڈیا اور دیگر ذرائع سے لاکھوں تک، بلکہ عالمی سطح تک پہنچا سکتے ہیں۔ یہ علماء امت کے وہ چراغ ہیں جو جہالت اور گمراہی کے اندھیروں میں روشنی پھیلاتے ہیں۔ اگر ان کے ذریعے یہ پیغام ان دلوں تک پہنچ جائے جو شکوک و شبہات یا بے یقینی کے شکار ہیں، اور ان میں سے کچھ دل بھی رب کریم کی طرف رجوع کر لیں، تو یہ ہمارے لیے باعثِ نجات اور فخر ہوگا۔

ملحدین کے اعتراضات اور ان کے جوابات کا مؤثر لائحہ عمل

ملحدین کے رویے اور اعتراضات کو سمجھنا ایک اہم پہلو ہے۔ ان کا مسئلہ یہ ہے کہ اکثر ان کے سوالات محض اعتراض برائے اعتراض کے زمرے میں آتے ہیں، جن کا

مقصد کسی حقیقت تک پہنچنا نہیں ہوتا بلکہ وقت ضائع کرنا ہوتا ہے۔ ایسے افراد کے ساتھ بحث مباحثہ کرنا عام طور پر غیر مفید ہوتا ہے، الا یہ کہ مجلس میں دیگر افراد موجود ہوں جو بغیر تعصب اور منصوبہ بندی کے بات کو سننے اور سمجھنے والے ہوں۔

یہ بھی قابل غور بات ہے کہ اعتراض کرنے والے اکثر اسلام کو غلط ثابت کرنے کے لئے ثانوی یا فروعی مسائل کو زیر بحث لاتے ہیں۔ مثلاً، ”فلاں قرآنی آیت میں یہ مسئلہ ہے“ یا ”فلاں حدیث میں یہ بات موجود ہے“۔ ایسے تمام اعتراضات، جن کا تعلق قرآن، حدیث، سیرت، فقہ اور دیگر اسلامی علوم سے ہے، اگر اللہ نے عمر دی، صحت عطا کی، اور سب سے بڑھ کر توفیق بخشی، تو ان شاء اللہ اگلی جلدوں میں ان تمام مسائل کا علمی اور منطقی انداز میں تفصیلی احاطہ کیا جائے گا۔ لیکن ایسی صورتحال میں، سب سے پہلے ضروری ہے کہ گفتگو کو اصولی بنیادوں پر لایا جائے۔ بغیر اصولی بحث کے فروعی مسائل پر بات کرنا بے معنی ہے۔ مثلاً، اگر آپ سے مخاطب شخص خدا کے وجود کو ہی نہیں مانتا تو اس سے یہ بحث کرنا کہ ”خدا نے فلاں جگہ یہ کیوں کہا“ وقت کا ضیاع ہے۔ پہلے یہ بات طے ہونی چاہیے کہ خدا موجود ہے یا نہیں، اور جب اس پر اتفاق ہو جائے تو دیگر اعتراضات کی طرف بڑھا جاسکتا ہے۔

ملاحذین کے اعتراضات کی نوعیت کو بھی سمجھنا ضروری ہے، کیونکہ اکثر ان کے اعتراضات کے پیچھے ان کے ذاتی مفروضے کارفرما ہوتے ہیں۔ ایسے میں ضروری ہے کہ بحث کو مذہب کے دائرے میں لا کر آگے بڑھایا جائے۔ مثلاً، سائنس کو سائنسی اصولوں کے ذریعے ہی سمجھا جاسکتا ہے، نہ کہ شاعری یا دیگر فنون کے ذریعے۔ اسی طرح مذہب کے اعتراضات کا جواب بھی قرآنی آیات اور احادیث کے ذریعے ہی دیا جائے۔ اگر ملاحذین دلائل کو یہ کہہ کر رد کرتا ہے کہ وہ خدا کے کلام کو مانتا ہی نہیں، تو اس

سے کہا جاسکتا ہے کہ جس ہستی کے متعلق سوال ہے، اس کا جواب اسی کی باتوں سے لینا سب سے مناسب ہے۔ مثلاً، اگر کسی عمارت کے بارے میں کچھ جاننا ہو تو معمار سے پوچھا جائے گا، نہ کہ کسی راہ چلتے شخص سے۔ اگر اس کے بعد بھی مزید وضاحت کی ضرورت ہو تو دیگر دلائل سے رجوع کیا جاسکتا ہے۔

مزید برآں، کچھ افراد جذباتی وجوہات کی بناء پر منحرف ہوتے ہیں۔ ایسے افراد کے ساتھ علمی دلائل کا انبار لگا دینا ان کے لئے غیر مفید ثابت ہوتا ہے۔ پہلے ان کے درد کو سمجھنا اور ان کے جذبات کا علاج کرنا ضروری ہے۔ اس کے بعد بتدریج خدا کی حکمت اور اس کی حکمت عملی کو ان کے سامنے پیش کرنا زیادہ مؤثر ہوتا ہے۔ بعض اوقات، بغیر کسی اضافی دلیل کے، ایسا شخص خدا کی طرف واپس لوٹ آتا ہے۔

ایک حکمت عملی یہ ہو سکتی ہے کہ ہم نوجوان نسل کی ذہنی سطح کو مد نظر رکھتے ہوئے سادہ اور قابل فہم انداز میں ان موضوعات پر گفتگو کریں۔ کتاب کے ساتھ ساتھ، ڈیجیٹل پلیٹ فارمز جیسے سوشل میڈیا، پوڈ کاسٹس، اور ویڈیوز کے ذریعے ان اعتراضات کا جواب دیا جائے۔ نوجوان نسل عام طور پر پیچیدہ فلسفیانہ مباحث میں الجھنے کے بجائے سادہ اور مؤثر پیغام کو ترجیح دیتی ہے۔

اسی طرح، ہمیں عوامی شعور بیدار کرنے کے لیے مکالمے (dialogue) اور مناظرے (debates) کے کلچر کو بھی فروغ دینا ہوگا۔ اگرچہ یہ فورمز ہمیشہ دلائل کی گہرائی کا مظاہرہ نہیں کرتے، لیکن ان کے ذریعے بڑی تعداد میں لوگوں تک پیغام پہنچایا جاسکتا ہے۔ مکالمے کے ذریعے مخالفین کو سمجھنے اور ان کے نقطہ نظر کو سننے کا موقع ملتا ہے، جو تعمیری بحث کا ذریعہ بن سکتا ہے۔

یہ بات قابل غور ہے کہ ہم میں سے ہر شخص ہر وقت فارغ نہیں بیٹھا کہ جب بھی کوئی

مسلحہ اپنی علم یا تعصب کے باعث اسلام پر اعتراض کرے، ہم فوری طور پر اس کے جوابات دینے لگیں۔ اس کے بجائے، ضروری ہے کہ ہم ان سے ان کے نظریات پر بھی سوال کریں اور ان کے موقف پر تنقید کریں۔ ان سے مطالبہ کریں کہ وہ اپنے عقائد اور مفروضات کا دفاع کریں۔ یہ اصول کہ دلیل کا بوجھ مدعی پر ہوتا ہے، ایک مسلمہ قاعدہ ہے، لیکن اکثر وقت اسی بات پر ضائع ہو جاتا ہے کہ مدعی اور مدعی علیہ کون ہے۔

اس مسئلے کو بہتر انداز میں دیکھنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم کائنات کی بنیادی حقیقت کو سمجھیں اور یہ جانیں کہ کون اس حقیقت کے خلاف اپنا مفروضہ پیش کر رہا ہے۔ دلیل کا بوجھ اسی پر ہوگا جو کائنات کے اصل نظریے کے خلاف اپنی بات رکھتا ہے۔ اس دنیا میں ہمیشہ اکثریت خدا کے وجود پر یقین رکھنے والوں کی رہی ہے، اور یہ نظریہ ہی اس کائنات میں اصل کا درجہ رکھتا ہے۔ لہذا، جو اس اصل کے خلاف کوئی دعویٰ کرے، اس پر دلیل فراہم کرنے کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔

علاوہ ازیں، یہ بھی ضروری ہے کہ ہم ان لوگوں پر خصوصی توجہ دیں جو الحاد کے خطرے سے براہ راست متاثر ہو رہے ہیں، جیسے یونیورسٹیوں کے طلباء یا جدید سائنسی علوم کے میدان میں کام کرنے والے افراد۔ ان کے لیے خاص ورکشاپس، سیمینارز، اور تربیتی سیشن منعقد کیے جائیں، جہاں نہ صرف ان کے سوالات کا جواب دیا جائے بلکہ انہیں اپنی فکری بنیادوں کو مضبوط کرنے کے لیے رہنمائی فراہم کی جائے۔

ایک اور اہم پہلو یہ ہے کہ ہم الحادی نظریات کے مقابلے میں اسلام کی مثبت تعلیمات کو زیادہ نمایاں کریں۔ عموماً الحادی اعتراضات صرف نفی پر مبنی ہوتے ہیں اور کسی متبادل نظریہ یا حل کو پیش نہیں کرتے۔ ہمیں اس بات کو اجاگر کرنا ہوگا کہ اسلام زندگی کے ہر پہلو میں کس طرح رہنمائی فراہم کرتا ہے اور اس کے اصول انسانیت کے

لئے کس قدر مفید اور متوازن ہیں۔

آخر میں، ہمیں اپنے رویے میں تحمل، برداشت، اور حکمت کو شامل کرنا ہوگا۔ اعتراضات اور تنقید کا جواب دیتے وقت ہمارا لہجہ نہ صرف علمی ہو بلکہ ایسا بھی ہو جو مخاطب کے دل کو چھو لے۔ ایک نرم اور ہمدردانہ انداز نہ صرف ہمارے پیغام کو مؤثر بنائے گا بلکہ اس سے ان لوگوں کے دلوں میں بھی تبدیلی لائی جاسکتی ہے جو ہمارے نظریات سے مختلف سوچ رکھتے ہیں۔

یہ حقیقت قابل توجہ ہے کہ بعض اوقات ہماری بات حق ہوتی ہے، لیکن اسے پہنچانے کا طریقہ ایسا نامناسب ہوتا ہے کہ اس کے باوجود کہ بات سچ ہے، اس کا نتیجہ فساد اور مخالفت کے سوا کچھ نہیں نکلتا۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم ہمیں حکمت اور نرمی سے بات پہنچانے کی تعلیم دیتا ہے، جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَلَا تَسْتَوِي الْحَسَنَةُ وَلَا السَّيِّئَةُ ادْفَعْ بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ فَإِذَا
الَّذِي بَيْنَكَ وَبَيْنَهُ عَدَاوَةٌ كَأَنَّهُ وَلِيٌّ حَمِيمٌ ۝ وَمَا يُلْقَاهَا
إِلَّا الَّذِينَ صَبَرُوا وَمَا يُلْقَاهَا إِلَّا ذُو حِظٍّ عَظِيمٍ۔

اور بھلائی اور برائی برابر نہیں ہو سکتے، (برائی کو) اس طریقے سے دفع کرو جو سب سے بہتر ہو۔ تو (دیکھو گے کہ) جس کے اور تمہارے درمیان دشمنی تھی، وہ گویا گہرا دوست بن جائے گا۔ اور یہ (عمدہ طریقہ) انہیں ہی نصیب ہوتا ہے جو صبر کرتے ہیں، اور یہ مقام صرف ان کو ملتا ہے جو بڑے نصیب والے ہوتے ہیں۔ (۱)

اسی تعلیم کو نبی کریم ﷺ کی سیرت مبارکہ میں بھی نمایاں طور پر دیکھا جاسکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللَّهِ لِنْتَ لَهُمْ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيظَ الْقَلْبِ

لَا نَفْضُؤْا مِنْ حَوْلِكَ۔ (۱)

پس یہ (لوگ) اللہ کی رحمت کے سبب سے آپ کے لیے نرم ہو گئے، اور اگر آپ سخت مزاج اور سنگدل ہوتے تو یہ لوگ آپ کے گرد سے منتشر ہو جاتے۔

یہی وہ طریقہ، یہی وہ کردار تھا جس نے غیروں کو اپنا بنایا، بلکہ دشمنوں کو دوست بنا دیا۔ لہذا محض سچائی بیان کر دینا کافی نہیں، بلکہ اسے پیش کرنے کا انداز بھی مؤثر اور دلنشین ہونا چاہیے تاکہ وہ سننے والے کے دل میں اتر جائے۔

اس ضمن میں امام غزالیؒ (رحمۃ اللہ علیہ) کی ایک نہایت اہم نصیحت ذکر کرنا مناسب ہوگا، جو انہوں نے الاقتصاد فی الاعتقاد میں تحریر فرمائی:

چوتھی قسم: وہ لوگ جو گمراہی میں مبتلا ہیں، مگر ان میں ذہانت اور فطانت کے آثار پائے جاتے ہیں، اور ان سے یہ امید کی جاسکتی ہے کہ وہ حق کو قبول کر لیں گے، کیونکہ ان کے عقائد میں شکوک و شبہات داخل ہو چکے ہیں یا وہ فطرتی طور پر سوالات اور شبہات کی طرف مائل ہو گئے ہیں۔ ایسے لوگوں کے ساتھ نرمی اور حکمت سے پیش آنا ضروری ہے تاکہ انہیں حق کی طرف مائل کیا جاسکے اور صحیح عقیدہ کی طرف رہنمائی دی جا سکے۔ ان سے مناظرے اور تعصب کے انداز میں بات کرنا درست نہیں، کیونکہ یہ رویہ ان کے گمراہی پر اصرار کو مزید بڑھادے گا اور انہیں اپنی باطل راہ پر مزید جم جانے پر ابھارے گا۔

اکثر جہالتیں عوام کے دلوں میں اس وجہ سے راسخ ہو جاتی ہیں کہ اہل حق کے کچھ جاہل افراد تعصب میں مبتلا ہو کر حق کو ایسے انداز میں پیش کرتے ہیں جیسے وہ کسی نظریاتی جنگ میں اپنی برتری ثابت کرنا چاہتے ہوں۔ انہوں نے کمزور مخالفین کو تحقیر اور تذلیل کی نظر سے دیکھا، جس کی وجہ سے ان کے دلوں میں ضد اور عناد کے جذبات ابھرے

اور وہ حق کی مخالفت پر مزید جم گئے۔ نتیجتاً، باطل عقائد ان کے دلوں میں گہرائی سے بیٹھ گئے اور نرمی و حکمت سے بات کرنے والے علما کے لیے بھی انہیں ان غلط نظریات سے نکالنا مشکل ہو گیا، حالانکہ ان کے فساد کی حقیقت بالکل واضح تھی۔

مناظرے اور ضد بازی ایک مہلک بیماری ہے جس کا کوئی علاج نہیں، لہذا ایک دیندار شخص کو اپنی پوری کوشش کرنی چاہیے کہ وہ اس سے بچے۔ اسے چاہیے کہ وہ کینہ اور دشمنی سے اپنے دل کو پاک رکھے، اور تمام مخلوق کو رحمت کی نظر سے دیکھے۔ گمراہ لوگوں کی اصلاح میں نرمی اور محبت کو اپنائے، اور سخت رویہ اختیار نہ کرے، کیونکہ یہی طریقہ زیادہ موثر ہے۔

اور اسے چاہیے کہ وہ ایسی سختی اور شدت سے بچے جو کسی کے گمراہی پر اصرار کو مزید بڑھا دے، اور وہ یہ حقیقت تسلیم کرے کہ جو شخص کسی کو ضد، تعصب اور ہٹ دھرمی میں مبتلا کر کے گمراہی پر مزید پختہ کرتا ہے، وہ درحقیقت بدعت اور باطل عقائد کے پھیلاؤ میں خود ایک مددگار بن جاتا ہے، اور قیامت کے دن اس پر اس کی جواب دہی بھی ہوگی۔ (۱)

یقیناً لوگ اسلام کے قریب آرہے ہیں، لیکن ذرا ایک مرتبہ غور کریں کہ اس میں ہمارا کردار کیا تھا؟ ان میں سے کتنے ایسے افراد تھے جو اسلام سے دشمنی رکھتے تھے اور کتنے فطرتاً معتدل مزاج تھے؟ حقیقت یہ ہے کہ اسلام دشمن اپنی اسلام دشمنی میں مزید بڑھ چکے ہیں، اور اس میں بہت بڑا قصور ہمارا ہے۔

ہمارا مقصد دین اسلام کی سر بلندی ہے، نہ کہ اپنی ذات کی برتری۔ اگر ہم اس فرق کو ملحوظ رکھیں تو بہت سی غلطیوں سے بچ سکتے ہیں۔ جب حق کی دعوت ذاتی انا، غصے اور تعصب سے پاک ہو کر دی جائے گی، تو وہی دعوت زیادہ موثر ہوگی، اور یہی وہ طریقہ ہے جو قرآن و سنت ہمیں سکھاتا ہے۔

Notes

Notes

Notes

Notes

Notes

Notes

Notes

Notes